

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_226359

UNIVERSAL
LIBRARY

تفسیر سورہ العصر

تالیف

استاذ امام مولانا حمید الدین فرای رحمہ اللہ

ترجمہ

ابن حسن صلاحی

باہتمام عبد اللہ صلاحی

اصلاح پریس کے امیر منجمی

۱۳۵۶ھ
۱۹۳۸ء

قیمت ۴۰

پیشکش
بیت

فہرست مضامین

صفحہ	نمبر شمار
۳-۱	(۱) سورہ کی دو تاویلیں۔
۴-۲	(۲) سورہ کا اجمالی مفہوم اور ماقبل سے تعلق۔
۱۲-۴	(۳) لفظ عصر کی تحقیق
۱۶-۱۳	(۴) زمانہ کی قسم کیوں کھائی
۳۰-۱۴	(۵) لفظ "تو" اور "صدا" سے اختلاف کا وجہ
۲۵-۲۰	(۶) "حق" و "صبر" کی شرح اور ان کا باہمی تعلق۔
۲۶-۲۵	(۷) سورہ کی وسیع تاویل اور جوامع الحکم میں سے ہونے کی وجہ۔
۳۵-۲۷	(۸) ایمان کا حقیقی مفہوم۔
۳۱-۳۶	(۹) ایمان کے خاص معنی اور اس کا سیاسی مفہوم۔
۴۶-۴۱	(۱۰) عمل صالح کی حقیقت۔
۴۷-۴۶	(۱۱) حق ہمارے خروج کی غایت ہے۔
۵۲-۴۷	(۱۲) حق و صبر کی توفیق اور ان کا باہمی تعلق۔
۵۳-۵۲	(۱۳) عمل اور تواضع کا باہمی تعلق۔
۵۵-۵۳	(۱۴) فرض و دعوت اور آزادی قبول۔
۶۱-۵۵	(۱۵) حق و صبر کی مزید توضیح
۶۷-۶۴	(۱۶) سورہ کا تعلق ماقبل و مابعد سے

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

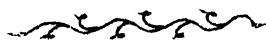
وَالْعَصْرِ ۝ (۱) زمانہ گواہی دیتا ہے۔

إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ خَسِيرٌ (۲) کہ آدمی گھاٹے میں ہے

إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَّصُوا بِالحَقِّ (۳) مگر وہ جو ایمان لائے اور بھلائی

کیں اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی

وَتَوَّصُوا بِالصَّبْرِ (۴) اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی۔



سورہ کی دو تاویلیں

(۱) جن لوگوں نے فصحاء عرب کے کلام کا دقت نظر سے مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے

ہیں کہ جب کوئی کلام دو معنوں کو غمائل ہو۔ عام اور خاص۔ اور حالت ایسی ہو کہ معنی

خاص، کلام کے موقع اور سیاق کی پوری موافقت کے ساتھ کسی خاص قوم یا کسی

خاص حالت کی طرف اشارہ کر رہا ہوا اور معنی عام بھی اپنی جگہ پر نہایت محکم اور بلند ہو تو ایسے موقع پر کلام کی دو تاویلیں کریں گے تاکہ کلام موقع و محل کی مخصوص رعایات کے ساتھ اپنے عموم اور وسعت کے فوائد کو بھی باقی رکھ سکے اور ان امور کی طرف اشارہ بھی کر سکے جن کیلئے اشارہ ہی بہتر ہے تصریح بہتر نہیں ہے۔ یہ ایک اصولی حقیقت ہے جو تمام مفسرین اور ارباب اصول کے یہاں مسلم ہو۔ اور ہم نے اپنی کتاب اصول التاویل میں اس پر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔

اس اصول کو سمجھ لینے کے بعد اب یہ بات جاننی چاہئے کہ سورۃ العصر جو ام الکلمہ میں سے ہے اور اس کی دو تاویلیں ہیں۔ ایک خاص اور محدود، دوسری عام اور وسیع۔ پہلے ہم خاص تاویل کے لحاظ سے اس کی تفسیر کریں گے جس سے پچھلی سورہ کے ساتھ اس کا تعلق بھی روشنی میں آئے گا۔ اسکے بعد اس کی عام اور وسیع تاویل پر بحث کریں گے اور یہ پہلو بھی مابقی سورہ سے بے تعلق نہ ہوگا۔

سورہ کا اجمالی مفہوم اور قبل سے تعلق

(۲) پہلی سورہ میں یہ بات بیان ہوئی تھی کہ ارباب نعمت و جہاد طلب مال و عیش دنیا کی خود فراموشیوں میں گم ہیں۔ ان کی زندگی اور زندگی کی تمام سرگرمیوں

کا محو دنیا ہے اور اسی کے عشق میں اٹھوں اپنی عمریں گواہیں جس سے بڑھ کر کوئی بے نیستی
اور نامرادی نہیں چنانچہ ایسے ہی لوگوں کی بابت ایک مقام پر فرمایا ہے۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِمَا	کہو، میں تمہیں خبر دوں ان لوگوں
الْآخِرِينَ أَعْمَاءَ لَا	کی جو بالکل گھائے میں رہے؟
الَّذِينَ صَلَّ سَعِيَهُمْ	(یہ لوگ ہیں) جن کی تمام سرگرمی
فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا	دنیا کی زندگی میں برباد ہوئی اور
وَهُمْ يَحْسِبُونَ أَنَّهُمْ	وہ سمجھتے رہے کہ وہ بڑا مفید کام
يَحْسِبُونَ صُنْعًا	کر رہے ہیں (یعنی جمع مال کینے)
أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا	اپنی محنتوں کو دانا کی سمجھتے
بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ	رہے اور جو لوگ آخرت کے کاموں میں
فَخِطَّتْ أَعْمَاءُ هُمْ فَلَا	مشغول تھے ان کو بیوقوف خیال
نُفَيْمُهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ	کیا، ایسی لوگ میں جنہوں نے اپنے
وَمِنْ نَافَا ذَٰلِكَ جَوَّاهُمْ	پروردگار کی نشانیوں (آیات
جَهَنَّمَ بِمَا كَفَرُوا	بعث و جزا) اور آخرت میں اسکے
وَاتَّخَذُوا آيَاتِي مَسْتَلٰ	سانے حضوری کا انکار کیا، پس

ہُزُوَاط ان کے تمام اعمال برباد ہو گئے (یہی)

..... خسرانِ عظیم ہے اور قیامت کے دن

..... انکی کوئی پوچھ نہ ہوگی، یہ انکا بدلہ

..... جہنم ہے جو جسکے کہ انھوں نے انکا کیا

..... اور میری نشانیوں اور میری رسولوں کے

..... ٹھٹھا سمجھا۔

یہ ان اربابِ نعمت کا بیان ہے جو دولت کے نشہ میں انبیاء و رسل کا مذاق اڑاتے تھے اور اللہ کی نشانیوں اور روزِ آخرت کے منکر تھے۔

اب سورہ والعصر پر غور کرو، ابتدائے سورہ میں ان لوگوں کی نام رادی کو بیان کیا، پھر اصل کامیابی کی طرف اشارہ کیا کہ اس عمرِ فانی کے اندر نیکی اور سچائی کی زندگی بسر کر کے، یہ دولت جاوداں حاصل کی جاسکتی ہے۔ پس لوگوں کو چاہئے کہ وقت کی قدر کریں اور غفلت و مستی کی نیند سے بیدار ہو کر، حسرت و افسوس کی ساعت سے پہلے، اس چیز کی سعی و طلب میں مشغول ہوں جو چاہئے کی ہے۔ ورنہ ایک دن آئے گا کہ وہ اپنی اس بے حالی و بواہی پر ماتم کریں گے۔ اور وہ وقت ماتم کا نہ ہوگا۔

حَتّٰی اِذَا جِآءَ اَحَدُہُمْ

یہاں تک کہ جب ان میں سے کوئی کی

الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ
 ارْجِعُونِي لَعَلِّي
 أَعْمَلُ صَالِحًا
 فِيمَا تَرَكْتُ كَلَّا
 إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ
 قَائِلُهَا وَمِنْ
 وَرَآئِهِم بَرْزَخٌ
 إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ
 فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ
 فَكُلَّا نَسَبٌ
 بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ
 وَلَا يَتَسَاءَلُونَ
 فَمَنْ ثَقُلَتْ
 مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ
 هُمُ الْمُفْلِحُونَ

موت سر پہا کھڑی ہونگی وہ کہے گا
 کہ اے میرے پروردگار مجھ کو واپس
 (دنیا میں) تاکہ میں جو کچھ چھوڑ آیا ہو
 (مال و دولت، اس میں جا کر نیک
 کام کروں۔ ہرگز نہیں بڑی یعنی وہ
 ہرگز دنیا میں اوٹمائے نہ جائیں گے)
 یہ اس کی زبانی باتیں ہیں (یعنی نہ
 ثواب ان کی تنہا پوری ہوگی اور
 نہ یہ اپنے وعدے میں سچے ہیں) اور
 ان کے چھپے ایک پردہ ہوگا (یعنی
 ایک آڑ جو ان کے اور ان کے دنیاوی
 مال و متاع کے بیچ میں حائل ہو جائیگی،
 قیامت کے دن تک پس جب صوفیوں کا
 جائزہ لگاتو نہ اس دن آپس کے رشتے قائم
 رہ سکیں گے نہ ایک دوسرے سے دُعا مانگ

وَمَنْ حَقَّتْ
مَوَازِينُهُ
فَأُولَٰئِكَ
هُمْ الْخَاسِرُونَ
فِي جَهَنَّمَ
خَالِدُونَ ۝

سکین گئے (یعنی بیٹ کے بعد بھی وہ اپنے
دنیاوی مال و متاع اور اعوان و
انصار کی حمایت محروم ہونگے صرف
انکے اعمال کی سلبیت انکے ساتھ
ہوگی) پس جنکے پہلے بھاری ہونگے (یعنی
جنہوں نے خیر باتی کی کمی کی ہوگی)

وہ لوگ کامیاب ہونیوالوں میں ہونگے۔
اور جنکے پہلے ہلکے ہوں گے (اسلئے کہ انھوں نے
نیک کام نہیں کئے اور ساری زندگی
زخارف دنیا کے عشق و مطلب میں
گنوا دی) وہ لوگ گھاٹے میں ہونگے
(یعنی اصل نامرادی اور بد بختی ہے ہمیشہ
جہنم میں رہیں گے۔

ان آیات سے جو ہم نے اوپر نقل کی ہیں معلوم ہوا کہ انسان کا خسران اس امر
پر نہیں ہے کہ روز جزا حقیقی ہے اور انسان چونکہ اپنے رکبے قبضہ تصرف میں ہے اس لئے

ایک روز وہ اپنی زندگی کے تمام اعمال و افعال اور خدا کی بخشی ہوئی تمام نعمتوں کے متعلق مسئول ہوگا۔ پس اس موقع پر ضروری ہوگا کہ پہلے بڑا کام کیا جائے۔ چنانچہ سورہ کے مطالب کی ترتیب یوں ہوئی کہ پہلے وہ لزوم جزا کو ثابت کرتی ہو پھر اس خالصہ عظمیٰ کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو اللہ کی بخشی ہوئی اس عظیم الشان نعمت یعنی اس زندگی کے قیمتی ایام ضائع کر دینے کی وجہ سے لاحق ہوگا۔ پھر آگے بڑھ کر کامیابی اور نجات کی راہ کھول رہی ہے۔ اور یہ ساری باتیں نہایت ایجاز و اختصار کے ساتھ صرف چند لفظوں میں بیان ہو گئی ہیں۔

لفظ عصر کی تحقیق

(۲) عصر کے معنی زمانہ کے ہیں۔ اس لفظ میں زمانہ کے مرور و ذہاب کی طرف اشارہ ہے۔ جس طرح لفظ ”دہر“ میں اس کی جمعیت کا اعتبار ہے۔ اسی طرح سے اس کا اطلاق بیشتر گزرے ہوئے زمانہ پر ہوتا ہے۔ امر القیس کا شعر ہے۔

وہل ینجمن من کان فی العصر الخالی

اور ان کے لئے کیا مبارکباد ہے جو گزرے ہوئے زمانوں میں تھے

عبید بن الابریص نے کہا ہے :-

فذل العصر قد ارانی یحملنی بازل شہوب

وہ بھی زمانہ تھا جب میں اپنے کو دیکھتا تھا کہ ایک نوجوان اور خوبصورت اونٹنی پر سوار

قد ارانی، یعنی حین کنت ارانی جیسا کہ سیاق سے ظاہر ہے۔

متلسس کا شعر ہے۔

عرفت لا صحاب البنائب جدۃ اذا عرفوا فی العصور الا اول

قطامی بھی اس لفظ کو اسی مفہوم میں استعمال کرتا ہے حالانکہ وہ جاہلی نہیں تھا۔

انی اہتدیت لتسلیم علی دمن بالغمغیرہن الاعصار اول

میں نے مقام غمر میں ایسے کھنڈروں پر سلام کیا جنکو گردش روزگار نے بالکل متغیر کر دیا۔

اسی مفہوم میں درید بن صمتہ نے بھی ایک شعر میں یہ لفظ استعمال کیا ہے۔

فان لا نترکی عن ذی سفلاھا تملک علیہ نفسک غیر عصرا

اگر تو مجھ کو توئی سے ملامت کرنا نہ چھوڑیگی تو زیادہ زمانہ نہ گزرے گا کہ اس پائیر نفس تھکے

خود ملامت کریگا۔

”غیر عصرا“ یعنی ”من غیر ان یمربک کثیر زمان“

اسی مرور و ذہاب کے مفہوم کی وجہ سے تیز و تند ہوا کے لئے اعصار کا لفظ

استعمال ہوا۔ دن کے آخری حصہ کو جب دن گزر کر گویا نچڑ جاتا ہے عصر کہتے ہیں۔

مختصر النبی اسی معنی کے اعتبار سے ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ لفظ عصر ایک طرف زمانہ گذشتہ کے حوادث و احوال یاد دلا رہا ہے دوسری طرف زمانہ کی ایک مخصوص صفت یعنی اس کی سرعت زوال و برق زقاری کی طرف توجہ دلا رہا ہے اور ان دونوں حقیقتوں کی وضاحت سے ہمارے سامنے دو اہم نتائج آتے ہیں۔ ایک یہ کہ انسانوں پر ان کے اعمال کے لحاظ سے اللہ کے فیصلے نافذ ہوں گے دوسرا یہ کہ ہم کو زمانہ سے جس کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت اس کی تیزروی اور برق زقاری ہے، زیادہ سے زیادہ مستعدی اور سرگرمی سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔

کلام عرب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب ایک حد تک ان حقائق سے آشنا تھے چنانچہ زمانہ جاہلیت میں جو لوگ حکمت آشنا تھے انھوں نے جا بجا اپنے کلام میں ان نکتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مشقب عبدی کا شعر ہے۔

ان الامور اذا استقبلتها تبتہت وفي تدبرها التیان والعبر

معاملات جب اول اول سامنے آتے ہیں متنبہ حالت میں ہوتے ہیں لیکن جہان پر

تدبر کرو تو ان میں بڑی بڑی بصیرتیں پنہاں ہوتی ہیں۔

قس بن ساعدہ نے کہا ہے۔

فی الذاہیین الاولین من القرون لنا بصائر

گزر جانے والی نسلوں میں ہمارے لئے بڑی بڑی عبرتیں ہیں۔

اس شعر میں ”بصائر“ کے لفظ سے عام عبرتوں کے علاوہ اس امر کی طرف بھی اشارہ ہے کہ مجبورِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے کیونکہ اسی شاعر نے اپنے ایک مشہور خطبہ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:-

تبلا رباب الغفلة من اے معشر ایاد! بھلی قوموں اور گشتہ

الامم الخالیه والقرن نسلوں میں سے جھوٹے اپنی زندگیاں

الماضیۃ یا معشر ایاد غفلت میں گنوائیں ان کیلئے ہلاکی

این الاءاء ولاجلاد ہو کہاں ہیں آباؤ اجداد! کہاں

واین المریض والعواد ہیں مریض اور ان کے عیادت کرتے ہوئے؟

واین الفراعنة الشداد کہاں ہیں طاقتور فرعون! کہاں

واین من بنی وشدید ہیں وہ لوگ جھوٹے فلک بوس

وزخرف ونجد و عمارتیں بنوائیں، جھوٹے آراستہ

غرة المال والولدین کیا اور سنوارا اور مال و اولاد کی

من بغی وطغی، وجمع محبت نے ان کو دھوکے میں رکھا

فاوعی، وقال انار بکم کہاں ہیں وہ جنہوں نے سرکشی کی اور
 الاعلیٰ، الہم یکنوا اکثر اکثر نے اور سمیٹا اور کہا انار بکم
 منکم اموالا واطول الا علیٰ کیا وہ مال میں تم سے زیادہ
 منکم اَجَلًا طعنہم نہ تھے عمروں میں تم سے بڑھ کر نہ تھے!
 الثری بکلکله ومزقہم لیکن کیا ہوا، زمین نے انکو پیڑیا
 بتطاوله فتلک عظامہم اور اس کی دست درازیوں نے ان کو
 بالیہ و بیوتہم پامال کر دیا۔ یہ ان کی بوسیدہ بٹیاں
 خاویہ، عمرتہا ہیں۔ ڈھلے ہوئے مکانات ہیں جن کو
 الذئاب العادیہ خود خوار بھیڑیوں آباد کر رکھا ہے، سرگز
 کلاب ہوا المعبود نہیں صرف وہی معبود ہے۔

اس کلام میں جملہ خوبیوں کے باوجود ایک نقص ہے۔ وہ یہ کہ اس نے مجازات
 کا ذکر نہیں کیا۔ قرآن جب ان امور کا ذکر کرتا ہے، عدل کے پہلو کی طرف ضرور اشارہ
 کرتا ہے۔ مثلاً۔ فِتْلَکَ بُیُوتُھُمْ خَاوِیَةً بِمَا ظَلَمُوا۔ یہ ان کے مسمار شدہ
 مکانات ہیں بوجہ اسکے انہوں نے ظلم کیا۔ قص نے جہاں بغی و طغی کہا ہے اس
 حقیقت کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا لیکن صرف زوالِ نعمت کے ذکر پر پہنچ کر

رک گیا۔ جزاء کے معاملہ کی طرف اس کی نظر نہیں گئی۔ قرآن مجید عموماً جزا پر ان واقعات سے استدلال کرتا ہے جو پچھلی قوموں کے ساتھ پیش آئے۔ دوسرے صحف آسمانی کا بھی یہی حال ہے۔ ان میں لزوم جزاء کی دلیل کے طور پر گذشتہ قوموں کے احوال و واقعات بیان ہوئے ہیں۔ باقی رہی زمانہ کی بے ثباتی اور بیوفائی تو یہ تو عربی شاعری کا نہایت پامال مضمون ہے۔ شعراء میں عدی بن زید کا تو گویا خاص مضمون ہی یہی ہے۔

اعاذل ما یدلک ان منیتی الی ساعۃ فی الیوم او فی صبح غد

اے ملامت گر تجھ کیا معلوم کہ میری موت آج کسی گھڑی میں آجائے گی یا کل۔

اعاذل ان الجہل من لذۃ الیفتی وان المناہی للرجال بمرصد

اے ملامت گر زندگی و شاہد بازی فوجوانی کی لذتوں میں ہوا و انسان کی موت ہمیشہ گھات میں ہے۔

کفر زاجر الیام و دہرہ تزوج لہ بالوا عظام و تعندی

آدمی کی تنبیہ کیلئے ایام روزگار کافی ہیں جنکی ہر صبح و شام صحیفہ عبرت کا ایک نیا ورق ملتا ہے۔ دیکھو کس قدر حکیمانہ باتیں ہیں تاہم جزاء اور دار آخرت کا کوئی ذکر نہیں۔

زمانہ کی قسم کیوں کھائی؟

(۴) لوگوں کو معلوم ہے کہ پچھلی قوموں پر اللہ تعالیٰ کے جو فیصلے نافذ ہوئے وہ ٹھیک ٹھیک ان کے اعمال کا بدلہ تھے اگر انہوں نے نیکیاں اور بھلائیاں کیں، خدا نے ان کو عروج و کمال بخشا، اگر انہوں نے ظلم و فساد کی راہ اختیار کی، قانون الہی نے ان کو تباہ و برباد کر دیا۔ انہی خفایاں کو یاد دلانے کیلئے خدا نے زمانہ کی قسم کھائی کہ لوگ یاد رکھیں کہ ایک دن اعمال کی اس حقیقت سے لازماً انکو بھی دوچار ہونا ہے۔ پھر زمانہ کی قسم میں ایک اور نازک نکتہ بھی مضمر ہے۔ وہ یہ کہ انسان کا اصلی راس المال زمانہ ہے اور اس کا حال یہ ہے کہ تیز روی اور برق رفتاری میں کوئی چیز بھی اس سے بڑھ کر نہیں لیکن یہ انسان کی کیسی نادانی ہے کہ وہ زمانہ کی اس بے وفائی سے واقف ہونے کے باوجود اس پر بھروسہ کرتا ہے اور اپنی زندگی کی بے ثباتی، روز قیامت کی باز پرس، اور جزائے اعمال کے قانون سے بالکل غافل ہے۔ اس معاملہ میں انسان کی مثال بالکل اس تاجر کی ہے جو برت کی تجارت کرتا ہے لیکن بجائے اسکے کوس کو جلد سے جلد بیچ کر اپنے دام وصول کرنے کی فکر کرے اس کو اس نے رکھ چھوڑا ہے اور اس کی چمک اور ٹھنڈک کا تماشا

دیکھ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے تاجر کو بہت جلد اپنی غفلت و نادانی پر کف افسوس ملنا پڑے گا۔

ٹھیک ٹھیک یہی حال اس غافل انسان کا ہے جو وقت کی قدر و قیمت سے غافل ہے جب موت کی گھڑی اسکے سر پر آجائے گی، حسرت و نامرادی کے سوا اسکے جیب و دامن میں کچھ نہ ہوگا۔ قرآن مجید جس نامرادی کا بار بار ذکر کرتا ہے اس کی حقیقت یہی ہے۔

بے شک وہ لوگ گھاٹے میں رہے	قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا
جھوٹ اللہ کے سامنے حاضر ہونے کو	بِلِقَاءِ اللَّهِ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُمُ
جھٹلایا۔ یا شک کہ جب قیامت کی گھڑی	السَّاعَةُ بَغْتَةً فَتَالُوْا
انکے سر پر دفعتاً آجائیگی وہ کہیں گے افسوس	يَجْسُرْنَا عَلَىٰ مَا وَطَّنَا
ہماری کوتاہی پر جو اس باب میں ہم سر	فِيهَا وَهُمْ يَحْمِلُونَ
ہوئی ہے اور وہ اپنے بوجھ اپنی پیٹھ پر	أَوْزَارَهُمْ عَلَىٰ ظُهُورِهِمْ
لا رہے ہوتے ہوں گے اور آگاہ کہ وہ برا بوجھ	الْأَسَاءَ مَا يَرْثُونَ وَ
ہوگا اور نہیں ہو دنیا کی زندگی مگر لہو لہب	مَّا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَعِبٌ
اور قیامت دار آخرت بہتر ہے ان لوگوں	وَهُوَ وَلِلْآخِرَةِ خَيْرٌ

لِّلَّذِينَ يَتَّقُونَ ۝ کیلئے جو پرہیزگاری کی راہ اختیار کریں۔

اور یہ جو مظلانی رحم وغیرہ بعض علمائے ”والعصر“ کی تفسیر میں کہا ہے کہ ”اقصہ بالذہر لا شتمالہ علی العجائب والعبث“ زمانہ کی قسم اس نے کھائی کہ گونا گوں نیسزنگیوں اور عبرتوں کا مجموعہ ہے، تو ان کا مطلب بھی وہی ہے جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کیا ہے۔

علاوہ بریں زمانہ کی تیز روی میں ایک پہلو بشارت اور تقویت صبر کا بھی ہے۔ کیونکہ اسی تھوڑی سی گزر جانے والی مدت کے عمل میں اگر انسان چاہے تو اجر و ثواب کا ایک لازوال خزانہ حاصل کر سکتا ہے۔ ایک بد بخت انسان اس حیات چند روزہ کی فانی لذتوں پر بھی کراہی مسرت و کامیابی سے محروم ہو جاتا ہے لیکن ایک عاقل اس فانی زندگی کے چند دنوں کے اندر، جن کی حقیقت ایک خواب یا برق خاطف سے زیادہ نہیں، تقویٰ اور ضبط نفس کی آزمائشیں جھیل کر اور اس باطل فانی سے بے نیاز اور اس حق باقی پر ثابت قدم رہ کر، جو آنکھوں سے اوجھل ہے، خدا کی خوشنودی اور محنت کا ابدی تحنت و تاج حاصل کر لیتا ہے۔

بہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ لفظ عصر محض بطریق مثل ہی نہیں آیا ہے بلکہ یہ قانون جزاء اور غفلت سرشت انسانوں کی نامرادی پر ایک محکم حجت ہے اور اسکے

ساتھ ہی اس میں تقویت صبر و تقویٰ کا بھی ایک پہلو ہے۔ غور کرو، قرآن کے ایک لفظ نے کس خوبی اور ایجاز کے ساتھ فوز و فلاح اور خسران و نامرادی کے دونوں پہلو بے نقاب کر دئے ہیں۔

لفظ ”وَتَوَاصَوْا“ سے خلافت کا وجوب

۵۔ انسانوں کی عام نامرادی بیان کرنے کے بعد ان لوگوں کی خصوصیات بیان کیں جنہوں نے اس حیات چند روزہ کے بدلہ ابدی مسرت و کامیابی حاصل کی۔ ان لوگوں کی تین خصوصیتیں بیان ہوئی ہیں۔ ایمان، عمل صالح، توہم۔ ان تین صفاتوں نے اپنے اندر دنیا و آخرت کی تمام بھلائیاں سمیٹ لی ہیں۔ جو لوگ اس کلام پر غور کریں گے وہ پائیں گے کہ باوجود غایت ایجاز ان الفاظ کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ نیکی اور بھلائی کی قسم کی کوئی بات ان کے دائرہ سے باہر نہیں رہ گئی ہے۔ ایمان تمام عقائد کا شیرازہ ہے۔ عمل صالح تمام شرائع کا مجموعہ ہے اور توہم ایک رتبہ کمال فضیلت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے مخصوص فرمایا اور اس امت میں سے بھی خاص طور پر ان لوگوں کے لئے جو ائمہ ہیں کیونکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اصلی ذمہ داری انہی پر ہے۔

اس تو اسی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کی شیرازہ بندی فرمائی اور ان کو اختلاف و نزاع کے تمام خطروں سے محفوظ کر کے بھائی بھائی بنا دیا۔ جب تک امت کے اندر یہ نظام باقی رہا، اس کے قدم برابر ترقی کی راہوں میں بڑھتے رہے جیسا کہ اوائل خلافت میں ہم دیکھتے ہیں لیکن جب یہ نظام دہم دہم ہو گیا دفعۃً بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ قرآن مجید کی آیت ذیل میں اس فرضیہ کی تفصیل کی گئی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا	اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو جیسا
اللَّهَ حَتَّى تُفْنِنُوهُ وَلَا تُؤْتُوا	کہ اس ڈرنے کا حق ہوا اور نہ مروت
إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ	مگر اس حالت میں کہ مسلم ہو۔ اور اللہ
وَأَعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ	کی رسی سب متحد ہو کر مضبوط پکڑ لو
جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا	متفرق نہ ہو۔ اور اللہ کے فضل کو اپنے
وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ	اوپر یاد کرو جب تم باہم ایک دوسرے
عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً	کے دشمن تھے اللہ نے تمہارے دلوں کو
فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ	باہم جوڑا اور اس کے فضل و مروت بھائی
فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا	بھائی بن گئے۔ اور تم آگ کے گڑھ

وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حَقَرَةٍ
 مِّنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمُ
 مِنهَا كَذَٰلِكَ يَبَيِّنُ اللَّهُ
 لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ
 تَهْتَدُونَ وَلَسْتُ
 بِمَعْرِفٍ مِّنْكُمْ
 إِلَىٰ الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ
 بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ
 عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَٰئِكَ
 هُمُ الْمُفْلِحُونَ وَلَا
 تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا
 وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ
 مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ
 وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ
 عَظِيمٌ... (الفرقان)

کے کنارے کھڑے تھے تو اللہ نے اس
 غم کو بچایا اسی طرح اللہ اپنی آیتیں
 کھول کھول بیان کرتا ہے کہ تم بتاؤ
 پاؤ اور چاہئے کہ تم میں سے ایک
 دعوت الی الخیر امر بالمعروف،
 اور نہی عن المنکر کے لئے ہو اور وہی
 لوگ فلاح پائیوائے ہوں گے اور
 ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو
 متفرق ہو گئے اور کھلی کھلی نشانیاں
 پانے کے بعد انھوں نے اختلاف
 کیا یہی لوگ ہیں جن کے لئے
 عذاب عظیم ہے.....
 (الفرقان)

.... كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ تم بہترین امت ہو جو لوگوں
 أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَعْلَمُونَ کی ہدایت کے لئے اٹھائے گئے
 بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ ہو۔ تم نیکی کا حکم دو گے، برائی کو
 عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُقِيمُونَ روکو گے، اللہ پر ایمان
 بِاللَّهِ لاؤ گے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس امت کے
 مہمات فرائض میں سے ہے چنانچہ اسکے متعلق دوسری آیات بھی وارد ہیں۔
 لیکن یہ امر واضح ہے کہ اس کی اصلی ذمہ داری جیسا کہ وَلَتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ
 سے متبادر ہوتا ہے، صرف امراء امت پر ہے۔ البتہ تو اسی ایک فرض عام ہے
 جس میں تمام مسلمان برابر کے شریک ہیں۔ اس سے معاملہ کی اصل حقیقت سامنے
 آتی ہے کہ مسلمانوں کو اپنی ذمہ داری سے عہدہ براہونے کے لئے ضروری ہے کہ
 وہ عمل صالح کریں، پھر ادائے حقوق کے معاملہ میں ایک دوسرے کی مدد کریں اور
 چونکہ ادائے حقوق بغیر خلافت و سیاست کے ناممکن ہے اسلئے ضروری ہے کہ خلافت
 قائم کریں اور خلافت کا قیام چونکہ اطاعت امیر پر منحصر ہے اس لئے ضروری ہے
 کہ ان کے اندر اطاعت بھی موجود ہو۔ اس حقیقت کی مزید توضیح کے لئے حق و ہر کی

پوری تغیر ضروری ہے اس لئے اب ہم اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

”حق“ و ”صبر“ کی شرح اور ان کا باہمی تعلق

۶۔ حق کے دو معنی ہیں۔ ایک معنی عام دوسرے معنی خاص۔ معنی عام کی تشریح ہم اس وقت کریں گے جب سورہ کی تفسیر کا عمومی پہلو بے نقاب کریں گے۔ معنی خاص کی تشریح یہاں کرتے ہیں۔

حق کے خاص معنی مواسات و ہمدردی کے ہیں۔ اس کے لئے دوسرا معروف لفظ ”مرحمۃ“ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو چیز دوسروں کے نزدیک محض ایک اخلاقی فضیلت کی حیثیت رکھتی ہے، عرب اپنے اوپر اہل کو ایک حق واجب خیال کرتے تھے۔ شعراء نے اکثر اس کا اسی حیثیت سے ذکر کیا ہے۔ ربیعہ بن مقروم کا شعر ہے :-

يَهْدُونَ فِي الْحَقِّ اِهْوَاهَهُمْ اِذَا اللّٰوْنَاتِ التَّحِيْنُ الْمَسِيْمَا

یعنی زمانہ قحط میں اونٹ و بچ کر کے بھوکوں کو کھلاتے ہیں۔

سویب بن ابی کابل الیشکری کہتا ہے۔

مِنْ اِنَاسٍ لَيْسَ مِنْ خُلَاقِهِمْ عَاجِلُ الْفَحْشِ وَلَا سَوَّاءُ الْجَوَاحِرِ

ایسی قوم میں سے ہیں جن کے اندر عاجلانہ بدگوئی اور گھبراہٹ نہیں ہے۔

عرفان للحق ما لغی بہ عند ملامر ما فینا خرع
 حقوق کو خوب پہچانتے ہیں، ان کی ادائیگی سے عاجز نہیں آتے اور کٹھن و قوتوں میں
 ہم کمزور نہیں ہوتے۔

بیدار نے کہا ہے۔

فان تقبلوا المعروف نصبر لحکمہ ونردم المعروف غفلا

کلام عرب میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔ پس گویا ”وَتَقَوَّاصُوا بِالْحَقِّ
 وَتَوَّاصُوا بِالصَّبْرِ“ بالکل ”وَتَوَّاصُوا بِالصَّبْرِ وَتَقَوَّاصُوا بِالْمَرْحَمَةِ“
 کے ہم معنی ہے اور دوسری آیت پہلی آیت کی تفسیر ہے۔ اب کچھ تمام بھلائیوں
 اور نیکیوں میں سے قرآن نے اس نیکی کو کس طرح چھانٹ لیا ہے جو درحقیقت سب کی
 اصل اور سب کا خلاصہ ہے۔ صرف مرحمت ہی کا رشتہ محبت ہے جو پورا اللہ اور کبھرے
 ہوئے دلوں کو ایک نقطہ پر مجتمع کرتا ہے۔ اور سب کو جو دو کرم اور فیاضی و ہمدردی
 کے جوش سے معمور کر کے زندہ و حساس بنا دیتا ہے۔ پہلی سورہ میں عشق و نیکی کی منافات
 کا ذکر تھا جو تمام بیماریوں کی جڑ ہے۔ اس میں وصیت مرحمت کا ذکر فرمایا۔ جس نے
 یہ جڑ یکم قلم کاٹ دی۔ اس کے بعد وصیت صبر کی تعلیم فرمائی کیونکہ جب تنگ آمدی

لوگوں کی پہنچانی ہوئی اذیتیں جھیلنے اور ان کی غلطیوں سے ختم پوشی اور رگد رکھا دی
 نہ ہو جائے اس وقت تک صحیح مرحمت وجود میں نہیں آسکتی۔ قرآن مجید نے حقیقت
 کی طرف اشارہ کیا ہے۔

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ
 اُدْخِلْنَا الْجَنَّۃَ مَعَ الْاَوَّلِیْنَ

ذٰلِكَ لِمَنْ عَزَمَ الْمَوْعِدَ
 یَا کَامِلِیْنَ

(شوریٰ)

اس آیت میں دیکھو، مرحمت صبر کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور اسی مقام کی خصوصیت
 نہیں، ان دونوں کے تلازم اور اجتماع کی مثالیں قرآن مجید میں عام ہیں۔ یہ دونوں
 ہمیشہ بالکل دو توام چیزوں کی طرح نمودار ہوتے ہیں۔ آل عمران کے خاتمہ کی
 آیت ہے۔ یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا صَبِرُوا وَاصْبِرُوا وَاُورِثُوا
 اس آیت میں امت کی شیرازہ بندی کی گئی ہے لیکن غور سے دیکھو وراثت و ابطا میں
 گرہ صبر ہی نے لگائی ہے۔ اسی کے مشابہ یہ آیت بھی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ صَبَرُوا
 مَکْرُوۡہٍ جَہَنَّمَ لَیْۤسَ لَہُمْ فَاۡتِنَہٗۃٌ وَّہُمْ لَا یَضِلُّوۡۤا

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
 کَمِیۡنَ

پس سورہ و المعصرین حق و صبر کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے دو

بنیادی نیکیوں کی راہ کھول دی۔ تفسیر سورہ ماعون اور تفسیر سورہ کوثر میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ اللہ اور مخلوق کی محبت ایمان کا پہلا رکن ہے۔ اور اسی چیز کو صلوٰۃ و زکوٰۃ کے دو لفظوں سے بیان کیا جاتا ہے۔ صلوٰۃ و زکوٰۃ کی اسی اہمیت کی وجہ سے صبر کا ذکر ان کے ساتھ بھی آتا ہے۔ نماز کے ساتھ قرآن مجید میں کئی جگہ نظر آتا ہے مثلاً

وَأَسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ

اور صبر اور نماز سے مدد چاہو۔

وَالصَّلٰوةِ (بقرہ)

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ

اور اپنے اہل کو نماز کا حکم دو

وَأَصْطَبِرْ عَلَيْهَا

اور اس پر ثابت قدم رہو۔

لیکن عربوں کے نزدیک صبر عجز و تذلل کے قسم کی کوئی چیز نہیں ہے جو عاجزوں اور در ماندوں کا شیوہ ہے۔ بلکہ یہ قوت اور عزم کی بنیاد ہے۔ کلام عرب میں اس کا استعمال بہت ہے۔ اور تمام استعمالات سے اسی مفہوم پر روشنی پڑتی ہے۔ حاتم طائی کہتا ہے۔

وَعَجْزٌ مَوْتٌ يَدْرِيْهَا هُوْدٌ

کیونکہ صلوٰۃ و التضرع میں

اور موت و ہلاکت کے کتنے ہوں تاکہ دریاہیں جن پر تلواروں کے پل ہیں۔

صَبْرًا لِّفِيْ نَهْكَهَا وَمَصَابِهَا

باسیافناختہ و بیخ و معبر صفا

ہم نے ان کے تمام آفات و شدائد کے مقابلہ میں اپنی تلواروں کے ساتھ ثابت
قدی دکھائی۔ یہاں تک کہ وہ ٹھنڈے ہو گئے۔
صبح کا شعر ہے۔

يَا ابْنَ الْحَاجَةِ الْمُدَارَةِ وَالصَّابِرِينَ عَلَى مَكَارِهِ
اے شریف سرداروں اور شہداء پر ثابت قدم رہنے والوں کی اولاد۔
زہیر بن ابی سلمیٰ نے کہا ہے۔

قُوْدُ الْجِيَادِ وَاصْفَاءُ الْمُلُوكِ وَصِيَا فِي مَوَاطِنَ لَوْ كَانُوا بِهَا سَمُومًا
میل گھوڑوں کی سواری اور بادشاہوں کی دہادری اور ایسے مورچوں میں
ثابت قدمی جہاں دوسرے ہمت ہار بیٹھتے

صبر کے معنی قرآن مجید نے خود کھول دے ہیں۔

وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ
وَالضَّرَاءِ وَجَحْيِ الْبِاسِ
اور صبر کرنے والے سختی میں تکلیف
میں اور بڑائی کے وقت۔

(بقرہ)

اس آیت میں صبر کے تین موقعے ذکر کئے ہیں۔ غربت، بیماری اور جنگ اور
درحقیقت تمام مصائب و شدائد کے ہی تین سرشتے ہیں۔ لوگوں کی ایذا دہی پھر

کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ وَلَمَنْ صَبَرَ وَخَفِيَ الْآيَةَ۔

اخلاق انسانی کی سب سے زیادہ حسین شکل یہ ہے کہ وہ شجاعت اور نرم خونی کا ایک دل آویز پیکر ہو۔ غور کرو و رحمت اور صبر کی کجائی نے کس طرح یہ خوبصورت پیکر آپ سے آپ تراش دیا ہے۔ اس کی تفصیلات بارہویں فصل میں ملے گی۔ پھر دیکھو، غیر معمولی ایجاز کے باوجود، کلام کی وسعت اور جامعیت کا کیا حال! مکرم اخلاق کے تمام ابواب دو لفظوں میں سمٹ آئے ہیں۔ دو لفظوں میں تمام برکتوں کا خزانہ ہے۔ طالبوں کے لئے رہبری ہے۔ دل کے تمام رگوں کا علاج ہے۔ نفس کے تمام دوسووں اور نزغات سے نجات کا نسخہ ہے۔ اب ہم سورہ کی اس عام اور وسیع تاویل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس کی طرف اس کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔

سورہ کی وسیع تاویل اور جوامع الکلم پس ہونے کی وجہ

۱۔ قصار (چھوٹی سورتیں) کی تاویل و تفسیر میں اہم جو اس قدر پھیلے ہیں اس سے کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ یہ محض تعمق و تکلف ہے۔ بلکہ ہم ایسا ان کے معانی کی وسعت کی وجہ سے کرتے ہیں۔ قصار کے وسیع معانی پر مشتمل ہونے کے لائل

اور وجہ بہت سہی، ہم ان میں سے بعض کو یہاں ذکر کرتے ہیں۔
۱۔ اگر قصار وسیع معانی پر مشتمل نہ ہوتیں، ان کو مستقل سورتوں کی حیثیت نہ دی جاتی۔

۲۔ ان کا نزول زیادہ تر ابتدائیں ہوا ہے۔ اور بیشتر اصولی تعلیمات پر مشتمل ہیں۔ کیونکہ ابتدائیں اصولی ہی باتیں تعلیم کی جاتی ہیں۔ اس کو بالا بحال ہم تاریخ قرآن میں لکھ چکے ہیں۔

۳۔ مذکورہ بالا اصول کی طرف خود قرآن مجید نے رہبری فرمائی ہے۔
كُنْزُ الْحِكْمَةِ آيَاتُهُ نُشْرَ فَصَّلَتْ مِنْ لَدُنْ حَكِيمٍ حَبِيبٍ ۝
۴۔ قصار کے جوامع الکلم میں سے ہونے کے اشارات خود ان کی عبارت کے اندر موجود ہوتے ہیں۔

۵۔ اس باب میں سلف سے بھی ایسے اقوال منقول ہیں جن کو ہماری خیال کی تائید ہوتی ہے مثلاً حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے سورہ والعصر کی بابت فرمایا: ”اگر لوگ تمہارا سورہ بر غور کریں تو ان کے لئے کفایت کرے“ اب ہم سورہ پر، اسکے عمومی پہلو کو پیش نظر رکھ کر غور کریں گے اور ایمان، عمل صالح، تواضع، حق اور صبر کے معانی اور ان کے باہمی تعلق کی توضیح کریں گے۔

ایمان کا حقیقی مفہوم

۱۔ ایمان کی اصل اس میں ہے۔ ایمان ہفت میں مختلف معانی کے لئے استعمال ہوا ہے۔

امندہ اعی اعطاه امنا اس کو امن دیا۔ قرآن میں ہے۔ **وَأَمَّنَّا لِمَنْ خَوْفِهِ**۔
 اس نے صدقہ واعتمد علیہ۔ اس کی تصدیق کی۔ اس پر اعتماد کیا۔
 امنہ بہ۔ یقین بہ۔ اس کا یقین کیا۔

قرآن مجید میں یہ لفظ مذکورہ تمام طریقوں سے مستعمل ہے۔ اسکے اشتقاق سے
 مومن کا لفظ اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنی میں سے ہے، اسلئے کہ اللہ تعالیٰ اپنی پناہ میں نبیوں
 بندوں کو پناہ دیتا ہے۔

یہ ایک قدیم دینی مصطلح بھی ہے۔ عبرانی میں (אמן) (امن) کا مادہ
 موجود ہے جس کے معنی صدق و اعتماد کے ہیں۔ اسی سے (آمین) آمین ہے جو
 ایک تصدیق و اعتماد کا کلمہ ہے۔ پس وہ یقین جو خشیہ، توکل اور اذعان کے تمام
 لوازم و شرائط کے ساتھ پایا جائے۔ ایمان ہے۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر اس کی
 آیات پر، اسکے احکام پر، ایمان لائے، اپنا سب کچھ اس کو سونپ دے اس کے

فیصلوں پر راضی ہو جائے وہ مومن ہے۔ ایمان عقل کے لئے ہدایت اور روشی ہے اور دل کے لئے پہارت اور پاکیزگی۔ اسلئے عقل اور ارادہ دونوں کو ایک ساتھ متاثر کرتا ہے اور عقائد و اعمال سب پر حاوی ہو جاتا ہے۔ پس قرآن کی اصطلاح میں مومن وہ شخص ہو جو خدا کا خالص و مخلص بندہ ہے اور جو اللہ تعالیٰ کے احکام و آیات پر یقین و اطاعت کی اس کیفیت کے ساتھ جازم ہے جس کی بنیاد رضا و محبت پر ہے۔

حقیقت کے سمجھ لینے کے بعد اب ایک اور حقیقت پر غور کرنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ بندوں کو ان کی سعی کے لحاظ سے درجے اور مناصب عطا فرماتا ہے۔ جو روح پاکیزگی اور پہارت کی راہ میں جس قدر بڑھتی جاتی ہے، تقرب الہی کے مقامات و منازل سے اسی قدر قریب ہوتی جاتی ہے اور چونکہ روح کی ترقی کی دورا ہیں ہیں ایک علم عمل کے اندر سے ہو کر نکلی ہے، دوسری قلب و ارادہ کے اندر سے۔ اسلئے علم عمل کی راہ میں اس کا ہر قدم اس کو ہدایت و تقویٰ سے قریب تر کرتا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا
وَدَادَهُمْ هُدًى
اور جنہوں نے ہدایت کی راہ پکڑ لی
ان کے مطابق عمل کیا ان کی ہدایت زیادہ

وَاتَّاهُمُ تَقْوَاهُمْ ۖ کی (یعنی علم) اور انکو بخش انکا تقویٰ
 (یعنی صحت ارادہ کیونکہ تقویٰ ہی تمام
 اعمال صالحہ کا سرچشمہ ہے۔)

پس بر علم نافع اور عمل صالح ہدایت و تقویٰ کا دروازہ کھولتا ہے اور علم و عمل
 کی زیادتی کا باعث ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی ایک سے زیادہ آیات سے ہمارے اس
 دعویٰ کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً فرمایا۔

وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ اور اب تک ایمان تمہارے دلوں
 فِي قُلُوبِكُمْ۔ کے اندر گھا نہیں ہے۔

یعنی تمہارا ایمان بھی مکمل نہیں ہوا ہے۔ اسلئے کہ اس نے علم سے ارادہ اور
 قول و عمل کی شکل بھی نہیں اختیار کی۔

دوسرے مقام پر فرمایا۔

أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ وہی لوگ ہیں کہ ان کے دلوں میں
 الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُمْ ایمان لکھ دیا اور ان کی اپنی طرف سے
 بِرُوحٍ مِّنْهُ۔ روح سے تائید کی۔

یہ ان لوگوں کی مودت کے ذکر کے بعد فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ

ایمان قلب سے تعلق رکھنے والی اور محبت کو جوش میں لانے والی چیز ہے۔

ایک اور مقام میں فرمایا۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ
حُبًّا لِلَّهِ۔
اور جو ایمان لائے وہ اللہ کی محبت
میں سخت ترین ہیں۔

ایک جگہ فرمایا ہے۔

فَلَا وَرَأَيْتَ الْيُؤْمِنُونَ
حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ
بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُونَ
فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا
مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا
تَسْلِيمًا۔
پس نہیں، تیرے رب کی قسم، ان کا
ایمان معتبر نہیں یہاں تک کہ وہ اپنے تمام
نزاعی امور میں تم کو حکم بنائیں، پھر تمھارے
فیصلوں سے اپنے دل میں کوئی تنگی نہ محسوس
کریں۔ اور کلی طور پر اطاعت
کریں۔

یعنی جس نے اپنے نفس اور اپنے تمام غرائم و اعمال کو پوری طرح اللہ کے
حوالہ نہ کر دیا وہ پکا مومن نہ ہوا۔ ایمان جن اعمال و عقائد کا مجموعہ ہے، ان میں سے
اس نے صرف چند پورے کئے۔ تمام نہیں پورے کئے۔
اسی مفہوم کی یہ آیت بھی ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ
 إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ
 وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ
 آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا
 وَعَلَىٰ نَبَاهِهِمْ يَتَوَكَّلُونَ
 الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ
 وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ
 أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ
 حَقًّا

مومن تو وہی ہیں جن کا حال یہ ہے
 کہ جب انکے سامنے اللہ کا ذکر آتا ہو انکے
 دل دھل جاتے ہیں اور جب انکو اسکی
 آیتیں سنائی جاتی ہیں، انکے ایمان
 کو زیادہ کرتی ہیں اور وہ اپنے پروردگار
 پر بھروسہ کرتے ہیں۔ جو نماز قائم کرتے
 اور جو کچھ ہم نے نفعی بخشی ہے، اس
 میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے
 ہیں، یہی لوگ سچ مچ کے مومن ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مومنین کی تعریف فرمائی ہے اور ان کے مندرجہ
 ذیل اوصاف گناے ہیں۔

(۱) اللہ کے ذکر سے ان کے دلوں پر خشیت طاری ہوتی ہے۔

(۲) آیات الہی کے سننے سے ان کا ایمان بڑھتا ہے۔

(۳) اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

(۴) نماز قائم کرتے ہیں۔

(۵) راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں۔ بس یہی لوگ سچے اور راستباز مومن ہیں۔
اسی کے مشابہ ایک اور آیت ہے۔

اِنَّ الْمَوْمِنِينَ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ
تُكْرَمُوْنَ يَّرْتَابُوْا وَاَجَاهِدُوْا
بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ
هُمُ الصّٰدِقُوْنَ

مومن تو بس وہی ہیں جو اللہ اور اس کے
رسول پر ایمان لائے اور پھر اس میں
کسی طرح کا تردد نہ کیا اور جان و مال
سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ یہی لوگ
سچے ہیں۔

.....

آیت ذیل بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

اَفَمِنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ
كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوُوْنَ
دیکھو! یہ ہیں، اللہ تعالیٰ نے مومن کو فاسق کا ضد قرار دیا اور تصریح کے ساتھ
فرمایا کہ دونوں برابر نہ ہوں گے۔

تفصیل کے بعد یہ بات آسانی سے سمجھ میں آگئی ہوگی کہ قرآن مجید میں، ایمان
کے بعد، جو عمل صالح کا ذکر آتا ہے وہ حقیقت ایک طرح کی تفصیل و توضیح ہوتی ہے۔

اور اس کی نوعیت بعینہ وہی ہے جو عطف خاص علی العام کی ہے۔ قرآن مجید میں اکثر دیکھا ہوگا کہ اطاعت رسول کو اطاعت اللہ پر عطف کیا ہے۔ یہ بھی عطف تفصیل ہے۔ کل کے بعد جزاء اور عام کے بعد خاص کا ذکر کر کے تفصیل کی جاتی ہے۔ کیونکہ بعض الفاظ کے بعض پہلو مخفی رہ جاتے ہیں، ایسے مواقع پر ضرورت ہوتی ہے کہ ان کو پوری طرح کھول دیا جائے۔ ایمان کے معاملہ میں اس توضیح کی ضرورت بالکل ظاہر ہے۔ ایمان کا محل دل اور عقل ہے اور عقل و دل کے معاملات میں انسان نہ صرف دوسروں کو دھوکا دے سکتا ہے بلکہ بسا اوقات خود بھی دھوکے میں رہتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ مومن ہے، حالانکہ وہ مومن نہیں ہوتا۔ اس لئے ایمان کے دو شاہد قرار دے گئے۔ ایک قول، دوسرے عمل۔ اور چونکہ قول بھی جھوٹ ہو سکتا ہے۔ صرف زبان سے اقرا کرنے والا مومن نہیں قرار دیا گیا بلکہ ضروری ہوا کہ آدمی کا عمل اسے ایمان کی تصدیق کرے۔ پس عمل ایمان کی اصلی کسوٹی ہے۔ فرمایا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا
لے ایمان والو، ایمان لاؤ۔

یعنی اے وہ لوگ جو زبان سے ایمان لائے ہو، عمل سے ایمان لاؤ۔
اسی کے مثل دوسری جگہ ہے۔

أَحْسِبُ السَّاسُ
کیا لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ یہ کہنے

اَنْ يُثَرَّكُوا اَنْ يَقُولُوا
 پر چھوڑ دے جائیں گے کہ ہم ایمان آئے۔
 اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ
 اور وہ آزمائشوں میں نہ ڈالے جائیں گے
 وَلَقَدْ فْتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ
 اور بیشک ہم نے آزمایا ان لوگوں کو جو
 قَبْلِهِمْ فَلْيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ
 ان سے پہلے تھے پس البتہ اللہ معلوم
 الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلِيَعْلَمَنَّ
 کریگا ان لوگوں کو جو سچے ہیں اور معلوم
 اَلْكَاذِبِيْنَ ۝
 کریگا ان لوگوں کو جو جھوٹے ہیں

پس اٰمنوا! کے بعد عملوا الصلحت کا جو ٹکڑا آتا ہے وہ حقیقت اٰمنوا
 کی تفصیل ہوتا ہے، البتہ عملوا الصلحت کو اٰمنوا! کا مقابل نہیں قرار دے سکتے۔
 کیونکہ ایمان کے معنی، جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے، ایقان کے بھی ہیں۔ پس تفصیل
 یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ سچا مومن وہ ہے جو ایمان اور عمل صالح دونوں کا جامع ہو۔
 خلاصہ بحث یہ ہے کہ ایمان ایک نفسانی و روحانی حالت کا نام ہے جو انسان
 کے تمام عقائد و اعمال پر حاوی ہے۔ وہ جس طرح علوم سے بڑھتی ہے اسی طرح اعمال
 سے بھی اس میں زیادتی ہوتی ہے۔ اس کے دو رکن ہیں۔ ایک علم دوسرا عمل۔ ان میں سے
 اگر ایک کو بھی ڈھادو گے، ان کی پوری عمارت ڈھ جائے گی۔ ایک شخص اللہ تعالیٰ
 کی ربوبیت اور دین کے تمام اصول و فروع سے خوب واقف ہے لیکن نافرمانی

اور گناہ پر برابر مصر ہے تو اسکے لئے اس ایمان میں سے کوئی حصہ نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کو
 نزدیک معتبر ہے۔ جہاں تک نفس علم یقین کا تعلق ہے، البیس کچھ کم نہ تھا تاہم وہ یقین
 نہ تھا۔ ایسا یقین معتبر نہیں۔ اس قسم کا یقین خود صاحب یقین کے خلاف حجت ہے۔
 اس سے اللہ تعالیٰ کا فہر و غضب اور بڑھتا ہے۔ فرعون اور اسکے ساتھی بھی یقین
 رکھتے تھے لیکن ان کا یقین ایمان نہ تھا۔

فَلَمَّا جَاءَهُمْ آيَاتُنَا	پس جب ان کے پاس ہماری
مُبْصِرَةٌ قَالُوا هَذَا	روشن نشانیاں میں انھوں نے کہا یہ تو
سِحْرٌ مُّبِينٌ وَجَدُوا	کھلا ہوا جادو جو اور ان کا انکار کیا
بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا	حالانکہ ان کے دلوں نے ان کا
أَنفُسُهُمْ ظَلَمَاقَ	یقین کیا، ظلم اور گھمنڈ کی وجہ سے
وَعُلُوًّا	

(ارنل ۱۳-۱۴)

اس کی وجہ ظاہر ہے۔ کہ علم اور ارادہ بالکل دو چیزیں ہیں۔ ان دونوں
 میں تلازم نہیں ہے۔ بحث علم کی پوری تفصیل سورہ سابقہ کی تفسیر میں گذر چکی ہے۔

ایمان کے خاص معنی اور اس کی سیاسی مفہوم

۸۔ لیکن ایمان کے ایک خاص معنی، ایقان کے بھی ہیں۔ قرآن مجید اس معنی میں اس لفظ کو ہمیشہ صیغہ فعل کی صورت میں لاتا ہے اور اس کے ساتھ اس کے تعلق کو بھی ذکر کرتا ہے۔ مثلاً

ایمان لایا (یقین کیا) رسول اس چیز	أَمَّنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ
پر جو اس پر تاری گئی اس کے رب کے جانب	الْبَيِّنَاتِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ
اور مومنین۔ ہر ایک ایمان لایا اللہ پر	كُلُّ أَمَّنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ
اس کے فرشتوں پر ان کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں	وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نَفَرٍ قُلُوبِهِ
(اور کہا) ہم اللہ کے رسولوں کے درمیان	أَحَدٍ مِّنْ دُسَّةٍ
تفریق نہیں کرتے (اور کہا) ہمیں قلب	وَقَالُوا اسْمِعْنَا وَاطْعْنَا
ہم نے سنا اور اطاعت کی۔	(بقرہ)

قرآن مجید کے اس استعمال سے بعضوں کو خیال ہوا کہ ایمان مقبر و یقی ہی تھا ہے اور یہ ایک یقین محض کی حالت ہے اس لئے نفل سے اس میں کوئی کمی یا زیادتی نہیں ہو سکتی۔ یقین اور عمل دو بالکل متباہن چیزیں ہیں، پس عمل یقین کا جز کیسے

ہو سکتا ہے۔ پھر ان لوگوں کو یہ خیال ہو کہ یہی رائے ہے جو ایمان عمل کے بابتیں
حضرت امام ابوحنیفہؒ نے بھی اختیار فرمائی ہے اس سے ان لوگوں کے خیال کو مزید
تقویت ہوئی۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ ایک واضح سلسلہ میں تاویل و توحیہ کے نہایت دور
ازکار پہنچوا اختیار کر لئے گئے۔

لیکن ہمارے نزدیک یہ سلسلہ بالکل واضح ہے حضرت امام ابوحنیفہؒ نے اس سلسلہ کو
بالکل اس نگاہ سے دیکھا ہے جس نگاہ سے ایک قاضی و فقیہ دیکھتا ہے یا امیر اسلام
وراثت و نکاح اور خراج و جزیہ وغیرہ معاملات و مسائل سیاسہ کے فیصلہ کرتا ہے
یہ قانون و سیاست کی نگاہ ہے جو حکمت و فلسفہ کی نگاہ سے بالکل مختلف ہے اس
اعتبار سے ہر وہ شخص مومن ہوگا جو اقرار کرے کہ وہ مسلمانوں کی جماعت میں سے ہے
یا مسلمانوں کے شعراء اور ان کے ظاہر حالات میں بالکل ان کے طریقہ پر ہو۔ ایسے
شخص کے متعلق جیسا کہ لکھا جائے گا کہ یہ مسلمان ہے۔ اس میں صادق و کاذب اور
مستحق و فاجر کی تفریق نہ کی جائے گی۔ اس ایمان میں سب برابر ہوں گے۔ اس میں
کئی ویشی نہیں واقع ہوتی۔ کیونکہ قانون اور سیاست کی نگاہ خدا اور بندہ کو درمیان
کے بطنی احوال و معاملات کی جستجو نہیں کرتی۔ یہ معاملات صرف قیامت کے دن بے نقاب
ہوں گے۔ سورہ حدید کی ایک آیت سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔

يَوْمَ تَشْرَى الْمُؤْمِنِينَ
وَالْمُؤْمِنَاتِ سَبْعَ نَوَافِلٍ
بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَيَأْمُرُهُمْ
بُنْشَرُكُمْ يَوْمَ تَحْبُتُ
تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا
الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا
ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ
يَوْمَ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ
وَالْمُنَافِقَاتُ لِلَّذِينَ
آمَنُوا انْظُرُوا وَصَافُوا
نَفْسِنَا مِنْ نُورِكُمْ قِيلَ
ارْجِعُوا إِلَى كُنُوفِكُمْ
فَلَمْ تَسْأَلُوا نُورًا فُضِبَتْ
بَيْنَهُمْ سُورَةُ بَابٍ
بِاطْنَةٍ فِيهِ الرَّحْمَةُ

جس دن تم دیکھو گے ایمان والے مرد
اور ایمان والی عورتوں کو، دوڑتی
ہوئی چلے گی ان کے آگے اور ان کے
رہنے ان کی روشنی (اور ہم کہیں خوش
خبری بہ تم کو آج کے دن۔ بارخیز چکے
نیچے نہریں جاری ہیں، ان میں ہمیشہ
رہو گے۔ یہی ہے سب سے بڑی کامیابی۔
جس دن کیسے منافق مرد اور منافق
عورتیں ایمان والوں کو، ذرا مہلت
دوہم کو، ہم بھی تمہارے نور سے
روشنی لے لیں۔ اُن سے کہا جائیگا،
لوٹ جاؤ پیچھے اور ڈھونڈو روشنی۔
پھر کھڑی کر دی جائیگی ان کے درمیان
ایک دیوار اس میں ہوگا ایک دروازہ
اس کے اندر رحمت ہوگی

وَمَا هُمْ مِنْ قَبْلِهِ
الْعَذَابُ يُنَادُوهُمْ
الْمُتَكَبِّرِينَ
بَلَىٰ وَاللَّيْلُ كُفْتُنْتُمْ
أَنفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ
وَأَرْتَبْتُمْ
وَعَرَّسْتُمْ
أَلَمَآ إِنِّي حَتَّىٰ جَاءَ
أَمْرُ اللَّهِ
وَعَرَّسْتُمْ
يَا لِلَّهِ الْغَمُ
وَرُفِئَتِ
لَا يُؤْخَذُ
مِنْكُمْ
فَذِيَّةٌ
وَلَا مِنَ الَّذِينَ
كَفَرُوا
مَا وَلَكُمْ
النَّارُ
طِهي
مَوْلَاكُمْ
وَبَشِّرِ
الصَّابِرِينَ

اور باہر کی طرف عذاب۔ یہ لوگ
ان کو پکاریں گے کیا ہم تمہارے
ساتھ نہ تھے؟ کہیں کیوں نہیں!
لیکن تم نے فتنہ میں ڈالا اپنے آپکے،
اور راہ دیکھتے رہے اور تک میں
پڑی رہی اور تم کو دھوکے میں رکھا
آرزوؤں نے۔ یہاں تک کہ آپنا لاشکا
حکم اور اللہ کے بارے میں تم کو دھوکے
میں رکھا شیطان نے پس آج نہیں
لیا جائیگا تم سے فدیہ اور ان لوگوں
سے جنہوں نے کفر کیا۔ تمہارا ٹھکانا
جہنم ہو ہی ہو تمہاری رفیق اور برا
ٹھکانا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایک جماعت ایسی بھی ہے جو دنیا کی زندگی میں تو مومن
کے ساتھ ہے لیکن آخرت میں ان سے علیحدہ کر دی جائے گی اور اس کا حشر کفر

کے ساتھ ہو گا۔ ظاہر ہے کہ ایسا اسی حالت میں ممکن ہے جب امیر اسلام مسلمانوں کو اور ان لوگوں کو جو اگرچہ مسلمان نہیں ہیں لیکن زبان سے اسلام کا اظہار کرتے ہیں، معاملات میں بالکل یکساں درجہ دے پس امام ابو حنیفہ نے اس بحث میں ایمان اسکے خاص مفہوم یعنی ایقان کو نہیں مراد لیا ہے بلکہ مجرد اقرار و اظہار مراد لیا ہے۔ یعنی ان کے سامنے سوال یہ تھا کہ ایمان قول و عمل دونوں کا نام ہے یا محض قول کا؟ یہ سوال نہ تھا کہ علم و عمل دونوں کا نام ہے یا محض علم کا۔ اگر سوال مؤخر الذکر صورت میں ہوتا تو اس کا جواب محض ایک ہی ہوتا۔ کیونکہ اس بارہ میں دور میں نہیں ہو سکتیں کہ ایمان علم و عمل دونوں کا مجموعہ ہے۔

اب غور کرو اس بارہ میں ایک قاضی کا مسلک کیا ہو گا؟ وہ ایمان کو صرف قول کے معنی میں لیتا ہے۔ ایسا کرنے میں اس نے کوئی غلطی نہیں کی ہے لیکن یہ ایمان کی کمی اور بیشی کا محل کیسے ہو سکتا ہے؟ اس سے معلوم ہوا کہ ایک قاضی کی نظر میں ایمان سے صرف وہ چیز مراد ہوتی ہے جو احکام قضا کے اجراء و نفاذ کی بنیاد ہے۔ اس کو ایمان کی حقیقت، اسکے اجزاء ترکیبی اور اس کی ظاہری و باطنی خصوصیات سے بحث نہیں ہوتی۔ اب اگر قرآن ایمان کی کمی اور زیادتی کی تصریح کرتا ہے تو اس تصریح کا اس مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ ایک بالکل دوسری چیز جو قرآن

اس سے ایک بالکل ہی مختلف بات کہتا ہے۔ بلاشبہ قرآن کا صاف فیصلہ یہی ہے کہ ایقان
و عمل دونوں ہر حالت میں یکساں نہیں رہتے۔ ان میں مختلف حالات کے ماتحت تغیر و تبدل
ہوتا رہتا ہے۔ کبھی کم ہوتے ہیں کبھی زیادہ۔ عقل سلیم اس صداقت کی تائید کرتی ہے پچھلی
میں ہم اس کی تفصیل کر چکے ہیں۔

عمل صالح کی حقیقت

۱۔ ”عَمَلُوا الصَّالِحَاتِ“ ایک جامع کلمہ ہے جس میں تمام اعمالِ حسنہ سمٹ
آئے ہیں۔ اور یہ سُلک کا ایک ظاہر پہلو ہے، جو محتاجِ تشریح نہیں ہے لیکن یہاں ایک
رفیقِ نکتہ بھی ہے جس پر غور کرنا چاہئے۔

اللہ تعالیٰ نے اعمالِ حسنہ کو ”صَلِحَات“ کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے جس سے
ایک عظیم الشان حکمت، کی طرف رہنمائی ہوتی ہے کہ درحقیقت انسان کی تمام ظاہری
و باطنی، دینی و دنیاوی، شخصی و اجتماعی، جسمانی و عقلی صلاح و ترقی کا ذریعہ اعمالِ حسنہ
ہیں۔ یعنی عملِ صالح وہ عمل ہوا جو انسان کی زندگی اور نشوونما کا سبب ہو اور اللہ تعالیٰ
نے اس کی فطرت میں جو صلاحیتیں و ولایت کی ہیں ان کے مطابق وہ عروج و ترقی
کے اعلیٰ مدار تک پہنچ جائے۔ یہی چیز انسان کے غایت وجود کو پورا کرتی ہے اور

اسی سے وہ درجہ کمال تک پہنچتا ہے۔ فطرت انسان سے یہی چیز مراد ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ
فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ
اور ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر بنایا۔

اور آیت ذیل میں عبادت سے یہی چیز مقصود ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ
إِلَّا لِعِبَادَةٍ
اور میں نے جنوں اور انسانوں کو مگر تاکہ میری عبادت کریں۔

عبادت یعنی طاعت الہی جس پر تمام شخصی و اجتماعی صلاح و فلاح کا دار مدار ہے۔ اس نکتہ کو دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ سکتے ہیں کہ انسان کائنات کی اس مجموعی شین کا ایک پرزہ ہے۔ اس لئے اس کے اعمال میں سے صالح اعمال صرف وہی ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی اس حکمت و تدبیر کے موافق ہوں جو اس نے اس کلی نظام کے لئے پسند فرمائی ہے۔ کیونکہ خدا نے اس دنیا کو عبث نہیں بنایا ہے۔ ایک خاص نظام و حکمت ہے جو اس پورے کارخانہ میں جاری ہے اور اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہے کہ اس کائنات کے اندر جو کچھ ہو اس نظام و حکمت کے ماتحت ہوگا۔
انگسہ ہو کر نہ ہو۔

اور یہ جو ہم اس کائنات کے ہر گوشہ میں ایک کشمکش اور تضاد م دیکھ رہے ہیں

تو یہ بھی درحقیقت اس کائنات کی ترقی اور نشوونما ہی کے لئے ہے۔ یہ تفسیر و تہمیل کا ایک سلسلہ ہے جو ہر پرانی حالت کو ایک نئی حالت سے بدل رہا ہے تاکہ یہ نظام اپنی حالت پر قائم رہ سکے۔

قرآن مجید میں صاف تصریح ہے کہ انسان کا ارتقا عمل صالح پر مبنی ہے اور تمام عالم، اللہ تعالیٰ کی تدبیر سے ایک خاص حکمت کی طرف جا رہا ہے۔

إِلَيْهِ يَصْعَدُ اَلْكَلِمُ الطَّيِّبُ

وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ وَالَّذِينَ يَمْكُرُونَ السَّيِّئَاتِ

لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَكْرُ أُولَٰئِكَ هُوَ يُسْوَوُ

لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَكْرُ أُولَٰئِكَ هُوَ يُسْوَوُ

لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَكْرُ أُولَٰئِكَ هُوَ يُسْوَوُ

لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَكْرُ أُولَٰئِكَ هُوَ يُسْوَوُ

لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَكْرُ أُولَٰئِكَ هُوَ يُسْوَوُ

لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَكْرُ أُولَٰئِكَ هُوَ يُسْوَوُ

لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَكْرُ أُولَٰئِكَ هُوَ يُسْوَوُ

لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَكْرُ أُولَٰئِكَ هُوَ يُسْوَوُ

اس اصول کی ایک سے زیادہ آیات میں تشریح ملتی ہے مثلاً فرمایا

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ
وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا
لَاعِبِينَ ۚ لَوْ أَرَدْنَا أَنْ
نُخْلِكَ لَكُنَّا لَكُنَّا
مِنْ لَدُنَّا إِنْ كُنَّا فَعَلِينَ
بَلْ نَقْذِرُ بِالْحَقِّ
عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ
فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۚ وَكَفَى
الْكَافِرِينَ مِمَّا تَصِفُونَ

اور ہم نے نہیں بتایا آسمان و زمین کو

در جو کچھ ان کے درمیان ہے۔

کھیل کرتے ہوئے۔ اگر ہم چاہتے کہ بتا

کوئی کھلونا تو ہم اس کو بناتے اپنے

پاس اگر ہم کو کرنا ہی ہوتا۔ بلکہ ہم

ماریں گے حق کو باطل پر پس وہ اس کا

سر توڑ ڈالے گا اور باطل ذلت پر بار

ہو جائے گا اور تمہارے لئے خرابی

ہے ان باتوں کی وجہ سے جو تم بیان

کرتے ہو۔

(الانبیاء)

اس تفصیل کے بعد حقیقت ابھی طرح کھل گئی کہ زمین کی دراشت صالحین کیلئے

کیوں مخصوص ہوئی مفہومین اس غایت کے خلاف چلتے ہیں جو اس عالم کی تخلیق

کا منشاء ہو اور صالحین اس روش پر چلتے ہیں جو صحیح منزل مقصود پر پہنچاتی ہے۔

اسلئے فرمایا وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصَّالِحِينَ

جو لوگ ایمان لائے اور بھلائیاں کیں اللہ ہم ان کو داخل کریں گے صالحین میں۔
 یعنی صلحا کے زمرہ میں جو حقیقت انبیاء، صدیقین اور شہداء کا زمرہ ہے۔
 قرآن مجید اور اگلے صحیفوں میں مفسدین کی ہلاکت اور صالحین کی برکت
 کا ذکر اکثر آیا ہے۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ	اور ہم نے زبور میں ذکر کے بعد لکھ دیا جو
مَنْ بَعْدَ الدِّكْرِ اَنَّ	کدامین کے وارث ہمارے صالح بند
اَلَا مَرَضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ	ہو گئے بیشک اس میں پیغام دہنی
الصَّالِحُونَ اِنَّ فِيْ هٰذَا	پیام خوشخبری ہے عبادت کرنے
لَبَلَاغًا لِّقَوْمٍ عَابِدِيْنَ	والی قوم کیلئے۔

”عبادت کرنے والی قوم“ یعنی وہ قوم جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی تابعدار ہو
 کیونکہ تمام صلاح و تقویٰ کی جڑ جیسا کہ معلوم ہو چکا، یہی ہے۔ نافرمان شخص صرف اپنا
 ہی دشمن نہیں ہوتا بلکہ تمام خلق کا دشمن ہوتا ہے۔ اسکے بیش نظر صرف اپنا نفس
 ہوتا ہے۔ اسلئے وہ شرائع و حدود کو نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے اور نہیں جانتا
 کہ اس کی بیہودہ حقیقت سب کی بہودہ سے وابستہ ہے۔ باقی رہے صالحین تو
 وہ زمین کے نمک ہیں۔ تمام عالم کی اصلاح و ترقی انہی کے دم سے ہے۔

وہ جو کچھ سوچتے اور کرتے ہیں تمام عالم کیلئے کرتے ہیں اور صرف اپنے انانہ زمانہ
 ہی کے لئے نہیں کرتے بلکہ ان نسلوں کے لئے بھی کرتے ہیں جو ان کے بعد آئیں گی۔
 اور یہی وجہ ہے کہ وہ وراثت عالم اور خلافت الہیہ کے مستحق ہوتے ہیں۔

حق ہمارے عروج کی غامیہ سنگ

۱۔ حق میں ہیں موجود و قائم کو کہتے ہیں لیکن استعمال کے لحاظ سے اس کے
 معانی مختلف ہو گئے ہیں۔ کم از کم تین معنوں میں تو اس کا استعمال عام ہے۔
 (۱) وہ بات جس کا وقوع قطعی ہو۔

(۲) وہ بات جو عقل کے نزدیک مسلم ہو۔

(۳) وہ بات جو اخلاقاً واجب ہو۔

قرآن مجید نے اس لفظ کو ان تمام معانی میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً
 إِنَّ ذَلِكَ حَقٌّ تَخَاصُّمُ الْهَوَىٰ وَالنَّاتِرِ۔ بے شک اہل دوزخ کا یہ جھگڑا
 ضرور واقع ہوگا۔ فَرُدُّوْا اِلٰی مَوْلٰہُمْ الْحَقِّ۔ وہ اپنے حقیقی مولے کی
 طرف لوٹائے جائیں گے۔ وَفِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلَّذِيْنَ اٰتٰوْا الْمَالَ وَم
 اور ان کے مالوں میں سائل و محروم کا حق ہے۔ یعنی ایک دین واجب کی غمگینی ہے۔

باقی رہے وہ خاص معنی یعنی ضعیفہ کی ہمدردی جس کا ذکر ہم نے بائیں فصل میں کیا ہے تو وہ اسی عام معنی سے متفرع ہے گویا اہل عرب کے نزدیک سب بڑا حق ہی ہو جو ہر متطیع پر لازم اور ہر مستحق کو مناسب ہے جو قتل کے نزدیک سلم اور تمام لوگوں کے نزدیک متعین و معروف ہے اسی لئے احسان کو معروف کہتے ہیں یعنی ایک ایسی بات جو ہر شخص کے نزدیک جانی پہچانی ہوئی ہے اور ایک قانون سلم کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حق یعنی مواسات کے اندر ان تمام معافی کی جھلک ہے جو اوپر بیان ہوئے ہیں۔ پس اگر حق کو اس کے عام اور وسیع معنی میں تو تو اس چیز کو کہیں گے جو عقل و دل دونوں کو ایک ساتھ محبوب ہو اور عظم عمل و ذوق پر حاوی ہو جائے اور جو ر و فساد کی ضد ہو۔

اسکے بعد ہم حق و صبر کی حقیقت کی طرف متوجہ ہونے ہیں تاکہ ان دونوں کے درمیان جو باہمی تعلق ہے وہ واضح ہو سکے اور اس سورہ کا نظم اسکے معنی کی وسعت کے لحاظ سے سامنے آجائے۔

حق و صبر کی توضیح اور ان کا باہمی تعلق

۱۲۔ نجات کا دار مدار عقلی اور اخلاقی قوی کی اصلاح پر جو اور عقل و دل دونوں

کے شدت ولینیت کے اعتبار سے دو پہلو ہیں۔ عقل کی لینیت اور نرم خونی کا پہلو یہ ہے کہ وہ فوراً حق کے سامنے جھک جانے کے لئے مستعد رہے۔ وہ جہاں بھی اور جس وقت بھی ظاہر ہو۔ اور قلب کی لینیت یہ ہے کہ وہ خالق کی محبت اور مخلوق کی ہمدردی میں ہمیشہ سرگرم رہے۔ پس عقل حق پر ایمان لاتی ہے۔ حق کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ اس کی صفات، اس کی آیات، اور قلب اپنی بندگی کا احساس کرتا ہے اور پھر بتاتا ہے اپنے مولائے حقیقی کی طرف بڑھتا ہے اور خلق کی ہمدردی کا جو فرض اس پر عاید ہوتا ہے، اسکے جوش و احساس سے عمور ہو جاتا ہے۔

عقل کی شدت کا پہلو یہ ہے کہ وہ اس حق پر، جو آنکھوں سے (وجھل ہے، ثابت قدم رہے اور اس باطل کو جو نگاہوں کے سامنے موجود ہے چھوڑے اور اس پہلو سے قلب کا فرض یہ ہے کہ وہ مصائب شدائد کے مقابل میں اپنے قدم جاریہ مستقیم سے نہ ڈگنے دے اور قدرت کے وقت عنود و رگدڑ سے کام لے۔

یہ حق کا تعلق قلب و عقل سے ہوا۔ بالکل ہی حال صبر کا ہے۔ وہ بھی عقل اور دل دونوں سے لگاؤ رکھتا ہے۔ اجمال ان تفصیلات کا یہ ہے کہ حق تمام بھلائیوں کے دروازے کھولتا ہے اور صبر تمام برائیوں کے دروازے بند کرتا ہے۔ یاد دلاؤ کہ غفلتوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ حق اصل مطلوب و محبوب ہے اور صبر اس کیلئے جوش و طلب

اور سرگرمی ہے۔ قرآن کی ایک آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ
فَالْوَارِثِينَ
اللَّهُ ثُمَّ اسْتَغَامُوا
.....
جو ربوبیت کا اقرار کرے گا وہ یقین و طاعت دونوں کا مجموعہ ہے کیونکہ

یعنی حق کو قبول کیا پھر اس پر پوری مضبوطی کے ساتھ ثابت قدم رہے۔

اہل بصیرت سے یہ راز مخفی نہیں ہے کہ حصول سعادت کے بعد اصلی چیزیں
استقامت اور دوام ہے۔ اب غور کرو، دونوں فطرتی و حق و سیر کے اندر تمام سادہ
اور بھلائیاں اس خوبی اور اختصار کے ساتھ جمع ہو گئی ہیں۔ اور ان دونوں کے
درمیان کس قدر گہرا اور وسیع تعلق ہے۔

یہاں یہ نکتہ قابل لحاظ ہے کہ صبر صرف اسی وقت مطلوب نہیں ہے جب
انسان تمام بھلائیوں کو حاصل کر چکے بلکہ ہر نعمت خیر کے بعد سک اور استقامت
کی ضرورت ہے تاکہ انسان مزید نعمت کا مستحق ہو سکے۔ صبر درحقیقت تمام بھلائیوں کا
معاون ہے۔ اسی لئے تم دیکھتے ہو کہ اس کو ترقی کا پہلا زینہ قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ
نے انبیاء علیہم السلام کو سب سے پہلے صبر کی تعلیم فرمائی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور جنکے

ساتھی کا جو واقعہ قرآن مجید نے بیان کیا ہے اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی نے سب سے پہلے حضرت موسیٰ سے صبر ہی کا مطالبہ کیا اور اسی چیز میں ان کا امتحان لیا۔ اس کی مزید تفصیل پندرہویں فصل میں آئے گی۔ یہاں محض اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود تھا کہ حق و صبر درحقیقت ہماری سیر باطن کے دو قدم ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ یہاں درحقیقت تفصیل و تفریع کا ایک سلسلہ ہے۔ ایمان ایک اصل اور مرکزی حیثیت سے تھا، اس کے بعد عمل صالح کا ذکر اس کی تفصیل کی حیثیت سے آیا۔ اسی طرح حق چونکہ دل اور دماغ دونوں کو محبوب ہے اور اسی پر ان دونوں کے عروج و کمال کا انحصار ہے اس لئے اس محبت کے نتیجہ کے طور پر صبر کا بیان ہوا۔ کیونکہ محبت کا اقدما یا سب سے پہلے شے محبوب کے لئے ثابت قدمی اور استقامت پیدا ہوا اور یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ثابت قدمی اور استقامت محبوب کی حیثیت کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ جو شے جس قدر محبوب ہوگی اس کے لئے اسی قدر پامردی اور استقلال کا جوش اُبھے گا۔ مدافعت، غضب و غیرت کے جذبات کا ظہور ہر شے کے لئے یکساں نہیں ہوتا۔ متفاوت ہوتا ہے۔ جو شے دل کو جس قدر عزیز ہوتی ہے اس کیلئے اسی درجہ کا جذبہ غضب و غیرت بھڑکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے غضب و انتقام کی بنیاد بھی یہی ہے کہ اس کو حق عزیز و محبوب ہو۔
 اس نے جو لوگ حق کو پاال کرتے ہیں ان پر اس کا قہر و غضب بھرتی ہے جو شے تم کو
 عزیز و محبوب ہے کیا تم اس کی تحقیر و اباحت چپ چاپ برداشت کرو گے؟ اس کی
 حمایت کے لئے تمہاری غیرت ضرور جوش میں آئے گی! ماں اپنے بچہ سے محبت کرتی
 ہے اور تم دیکھتے ہو کہ یہ محبت تنہا نہیں ہوتی بلکہ اپنے ساتھ ایک مجنونانہ غیرت بھی رکھتی
 ہے اور جب وقت آتا ہے، ماں کو بچہ کی حمایت میں قربان کر دیتی ہے۔ یہی جوش تھا
 وغیرت قوموں میں اپنے قومی و وطنی حقوق و مقاصد کے لئے ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ
 ایک سکین کبوتری بھی اپنے انڈوں اور بچوں کے لئے اپنے اندر محبت کا جذبہ اور غیرت
 کا جوش رکھتی ہے۔ اگر تم اس کے انڈوں اور بچوں کو اس سے چھیننا چاہو گے۔
 اپنے کمزور بچوں سے ضرور تم کو دفع کرنے کی کوشش کرے گی۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ صبر درحقیقت محبت حق سے پیدا ہوتا ہے،
 علاوہ ازیں ایک نکتہ بھی پیش نظر رکھنا چاہئے۔ وہ یہ کہ ”حق“ جیسا کہ ہم
 اوپر بیان کر چکے ہیں، ستر ماں سر غیب ہے اس وجہ سے اسکے لئے صبر کی اور زیادہ
 ضرورت ہے۔ قرآن مجید میں اس نکتہ کی طرف اشارہ ہے۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَعَدَ اللَّهُ

بِسْمِ ثَابِتٍ قَدَمِهِ بِشَيْكَلِ اللَّهِ كَلَامُهُ

حَقُّ

ضرور واقع ہوگا۔

حق و صبر کے باہمی تعلق کے ان پہلوؤں کو برابر پیش نظر رکھو۔

۱۳۔ عمل اور توہمی کا باہمی تعلق

۱۳۔ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اہل حق و صبر ہیں اور ان چیزوں پر عمل کرنے کے بعد دوسروں کو ان کی تلقین کرتے ہیں۔ تفصیل آیت کے اندر موجود ہے لیکن اس کی تصریح نہیں فرمائی گئی ہے کیونکہ اولاً تو اَمُّوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ اس پر عمل ہے ثانیاً غلط عمل کی برائی اس قدر واضح ہے کہ اس موقع پر جو مدح کا ہے اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح ایمان سے عمل صالح پیدا ہوا اسی طرح عمل صالح سے توہمی وجود میں آیا کیونکہ جس شخص کی نگاہوں میں حق محبوب ہو جائے گا اور وہ اس کے لئے صبر و استقامت کی تمام کڑیاں پھیل لے گا، اس کے بارے میں اس کا علم، اس کی محبت، اس کی غیرت ہر چیز بڑھ جائے گی۔ اوداب وہ صرف اسی قدر نہیں چاہے گا کہ خود اس سے محبت کرے بلکہ یہ بھی چاہے گا کہ تمام دنیا اس سے

عشق کرے۔ اور جہاں کہیں حق کو مظلوم و مقہور اور باطل کو غالب فتح نہ دے گا
تڑپ جائے گا۔ اور ایک غیور اور شریعت نوجوان کی طرح دوسروں کو ابھاریگا۔
کہ حق کی حمایت کے لئے آمادہ ہوں اور اس کا یہ ابھارنا بھی درحقیقت خود اسی کی
حمایت حق کا ایک جز ہوگا۔ پس یہاں تو اسی عمل صالح کے ایک جز کی حیثیت ہو
ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر تفصیل و توضیح کے طریقہ پر فرمایا ہے۔

پھر اوپر ہم بیان کر چکے ہیں کہ عمل صالح ہی امن اور تمدن کی بنیاد ہو۔
پس اس اعتبار سے عمل صالح کا سب سے اہم جز تو صبر و صبر کو ہونا چاہئے قرآن مجید
میں ان دونوں کے اجتماع کی ایک اور لطیف مثال بھی ہے۔ فرمایا ہے۔
تَعَاوُذًا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ نِیکِی اور تقویٰ پر تعاون کرو۔

اس آیت میں، 'بر' درحقیقت حق کے قائم مقام ہے اور تقویٰ صبر کی
ایک دوسری تعبیر ہے اس لئے کہ تقویٰ کے معنی ہیں نفس کو لغزش کے مواقع پر
حمایت حق میں ثابت قدم رکھنا۔

فِرْضِ رِعْوَتِ اور آزادی قول

۱۴۔ گذشتہ صفحات میں عمل صالح، حق، صبر اور تواضع وغیرہ کی جو تفسیر ہم نے

بیان کی ہے اس سے ابھی طرح واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس ایک سورہ کے چند الفاظ کے اندر سیاست، تعاون اور اتحاد معیشت کے کیا کیا اصول فرمائے بیان فرمائے ہیں۔ اور اجتماع کے عام معاملات و احوال سے الگ تھلگ رہنے کے خیال کا کس طرح ابطال کیا ہے۔ اور چونکہ یہ سورہ صرف امورِ مہمہ کے بیان کے لئے مخصوص تھی اس لئے اس میں تو اسی کا ذکر کرنا ہمارے دعویٰ پر صاف حجت ہو۔

پھر ایک قدم آگے بڑھ کر یہ بات بھی صاف ہو گئی کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہم پر تو اسی کا فرض عاید کیا ہے تو لازماً ہم کو انہماق کے لئے آزادی قول بھی بخشی ہے۔ چنانچہ ہم اسلام کے اصول میں یہ بات پاتے ہیں کہ ایک طرف تو امت پر یہ فرض عاید کیا گیا ہے کہ وہ امیر کی کامل اطاعت کرے اور دوسری طرف اس پر یہ ذمہ داری بھی عاید کی گئی ہے کہ وہ حق کا اعلان کرے اور نصیحت کا کلہ کمزور ہر خوف سے مباح ہو۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس امت کو اللہ تعالیٰ نے شہداء کے لقب سے ممتاز فرمایا اور خلفائے راشدین کا یہ حال تھا کہ بڑھیا عورتیں انکو برسرِ منبر نہ کہتی تھیں اور وہ ان نصیحتوں کے سامنے سر جھکا دیتے تھے۔ ایسویہ سے اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ کا حکم دیا تاکہ لوگوں کو کلہ حق کہنے کی جرات ہو۔ چنانچہ صحابہ کا یہ حال تھا کہ وہ اپنی ریں پوری بیخونی سے ظاہر

کرمیتے تھے اگرچہ ان میں سے کسی کی رائے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کے خلاف ہو۔

لیکن یہ بات فراموش نہ کرنی چاہئے کہ آزادی رائے فتنہ و فساد کے قسم کی کوئی چیز نہیں ہے۔ ہمارا اصلی فرض برو تقویٰ کے لئے تعاون ہے۔ اس اصل عظیم کو ہمیشہ نگاہ میں رکھنا ہوگا۔ اس لئے اگر ایسا ہو کہ ہم کسی معاملہ میں کوئی رائے دیں اور ہماری وہ رائے نہ مانی جائے تو ہم کو فتنہ و فساد کا حق حاصل نہ ہوگا۔ عصیان و انکار کا حربہ آخری حربہ ہے۔ جب تمام اسلحہ بیکار ہو جاتی ہیں، اس وقت یہ ہتھیار اٹھایا جاتا ہے اور وہ بھی اس وقت جب تمام جماعت نافرمانی پر آمادہ ہو۔ آیت وَلَا تَقْسِدُوا فِي الْغَوَا کی تفسیر کرتے ہوئے ہم نے اس نکتہ پر فصل بحث کی ہے۔ اس لئے یہاں سرسری اشارہ کافی ہے۔

حق و صبر کی مزید توضیح

۱۵۔ اگر پچھلی فصلوں کو تم نے بغور پڑھا ہے تو یہ بات بالکل صاف نظر آگئی ہوگی کہ حق و صبر کی حیثیت و حقیقت دو عظیم اشیان ہماروں کی ہوجن پر شریعت غرائے اسلامیہ کے ستون اور اس ملکوت اللہ کے ارکان قائم ہیں۔

اوپر گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے
حق یعنی عدل و حکمت کے ساتھ چنانچہ فرمایا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا
لِفَسَادِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ
اگر حق ان کی خواہشوں کی پیروی
کرتا تو آسمان و زمین دونوں دہم
برہم ہو جاتے۔

یہی وجہ ہے کہ جب خدا اس زمین کی خلافت اور نبوت و شریعت کی نعمت
کسی قوم کو بخشا ہے تو اسکے لئے سب سے پہلی شرط یہ ہوتی ہے کہ وہ قوم حق کی
اطاعت کرنے والی اور قسط کو قائم کرنے والی ہو۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا
قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ هَذَا
اے ایمان والو! عدل کے قائم کرنے
والے بنو۔ اللہ کے لئے گواہی دیجئے ہو
(یعنی قسط کی گواہی) اگرچہ خود تمہارا ظالم ہو۔

قسط سے مراد حق ہے اور علم اور عمل دونوں سے اس کا تعلق ہوتا ہے

چنانچہ فرمایا۔

”وَأُولَٰئِكَ قَائِمًا بِالْقِسْطِ“ دوسری جگہ فرمایا ”وَأَحْكُم بَيْنَهُم
بِالْقِسْطِ“ ایک جگہ ہے ”قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ“ وَالَّذِينَ يَأْمُرُونَ

بِالْقِسْطِ، پھر فرمایا يٰهٰدُوْنَ بِالْحَقِّ وَاِلَيْهِ يَعْدِلُ الْوُحُوْنُ اسی طرح وَقَالَ رَبِّ
 اَحْكُم بِالْحَقِّ ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ فَاَحْكُم بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَاللّٰهُ
 يَقْضِيْ بِالْحَقِّ

ان آیات سے معلوم ہوا کہ حق کا قیام اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے لازمی فرمایا ہے۔
 کیونکہ اس نے آسمانی بادشاہت کی بنیادیں اسی بنا پر قائم کی ہیں۔

یَا دَاوُدُ اِنَّا جَعَلْنَاكَ	اے داؤد جنے مگزین میں غلیم بنایا ہے
خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ	پس لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو
فَاَحْكُم بَیْنَ النَّاسِ	(یعنی قطع کے ساتھ) اور ہمیشہ کی سچو پہلو
بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰی	کیونکہ حق ہی کے راستہ سے انحراف نہ کرو کہ تھیں
فَیضِلَّكَ عَنْ سَبِیْلِ	کے راستہ سے ہٹا دے (اس آسمانی بادشاہت کے
اَللّٰهِ اِنَّ الدِّیْنَ	راستہ سے جو جبکہ تم اللہ تعالیٰ کی طرف سے غلیم
بِیْضِلُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ	مقرر ہو گئے ہو) بیشک لوگ اللہ کے راستے سے
اَللّٰهُ هُوَ عَذَابُ	بھٹک جائیں گے ان کیلئے سخت عذاب ہے جو کہ
مَشِدِّیْدٌ یَّمَّا تَسُوْا	کہ انھوں نے حکم دیا کہ ان کو فراموش کر دیا (حق)
یَوْمَ الْحِسَابِ	کا دن یعنی ظالموں کے بدلہ پانیکاروں) اور جنہ

وَمَا خَلَقْنَا
السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ
وَمَا بَيْنَهُمَا
بَاطِلًا ذَلِيلًا
ظَنُّ الَّذِينَ
كَفَرُوا

نہیں پہچان سکتے تھے کہ زمین کو اور جو کچھ ان کے
درمیان ہے باطل درجہ اپنی مخلوق کیسے کیسے
پسند کر سکتے ہیں کہ وہ حق کہہ رہے ہوں
ہو گا یہ (یعنی آسمان و زمین کا بے مقصد ہونا)
باطل پیدا ہونا، ان لوگوں کا گمان ہے کہ جو
کفر کیا یعنی اللہ تعالیٰ کی پروردگاری کا انکار کیا

اب صبر پر غور کرو۔ جن قوموں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب بخشی پہلے ان کے
صبر کا امتحان لیا اور جب اس امتحان میں پوری اتریں، اپنی عزت و نعمت کے تاج
سے ان کو سرفراز فرمایا۔ اور ایسا ہونا ضروری ہے۔ اگر کوئی عظیم الشان بن یا بلند عمارت
تعمیر کرنی ہے تو اسکے لئے سب سے پہلے ایک ایسی سخت زمین کی تلاش ہوتی ہے
جس پر ایک ٹھوس بنیاد قائم کی جاسکے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ قوموں کے انتخاب کے
معاملہ میں ایسا ہی کرتا ہے۔ پہلے ان کو مصائب شدائد میں آزماتا ہے جب اس میں
وہ بالکل کچی ثابت ہوتی ہیں، اپنی امانت ان کے حوالہ کرتا ہے اور ان کو ایک نئی امت
کی صورت میں نئی طاقتوں سے مسلح کر کے کھڑا کرتا ہے اور ان کے تمام دشمنوں کو باطل
کر دیتا ہے۔ قرآن مجید میں اس قانون (جملہ کا بار بار ذکر فرمایا ہے

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتَّىٰ نَعْلَمَ
الْمُجَاهِدِينَ مِنْكُمْ
وَالضَّالِّينَ وَنَبْلُوَنَّكُمْ
رُوسَىٰ جَدًّا فَرَمَا۔

اور ہم تم کو آزمائیں گے یہاں تک کہ جان
لیں تم میں سے مجاہدین کو اور ضالین کو
اور جانچ لیں تمہارے احوال کو۔

إِنْ يَمْسَسْكَ فُتْرُحٌ
فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ فُتْرُحٌ
مِّثْلُهُ وَتِلْكَ الْآيَاتُ
نُذَارًا لِّمَنْ أَبَىٰ النَّاسُ
وَلِيَعْلَمَهُمُ اللَّهُ الَّذِينَ
آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ
شُهَدَاءَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ
الظَّالِمِينَ وَلِيَعْلَمَنَّ
اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيُخَوِّفَ
الْكَافِرِينَ ۚ أَوْ حَسِبْتُمْ
أَنْ تَدَّخُلُوا الْجَنَّةَ

اگر تم ٹکڑے ٹکڑے ہو جاؤ تو غم کی باتیں آئیں
مخالفوں کو بھی زخم پہنچاؤ اور یہ ایام لوگوں
کے درمیان ہم پھیر بدل کرتے رہتے ہیں،
اور تاکہ اللہ ان لوگوں کو جان سے جو غم
میں سے ایمان لائے (یعنی پیچھے) اور جان
تم میں سے شہداء (یعنی ائمہ عدل) اور اللہ
نہیں دوست رکھتا ظالموں کو اور تاکہ
پاک بن کر اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے
اور جانے کافروں کو کیا تم نے گمان
کر رکھا ہے کہ تم فخر ہو جاؤ گے جنت میں
اور ابھی تک نہیں معلوم کیا اللہ نے ان

وَلَمَّا يَعْلَمُوا الذِّنِّ حَافِدًا لَّوْگُوں کو جو تم میں سے جی بہیں اور نہیں

مِنْكُمْ وَاعْلَمُوا الصَّبْرَ لَیْنُ کیا ان لوگوں کو غنابت قدم پہنوالے ہیں۔

اور بنی اسرائیل کے قصہ میں یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو گئی ہے کہ ان کی عزت و ذلت کا دار تمام تر صبر پر تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو جو کچھ بخشا ہے ان کے اعمال کے اعتبار سے بخشا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے وَلَکِنَّصْرَنَا اللَّهُ مَنْ لَیْنُصْرُکَ جو اللہ کی مدد کریں گے اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے گا وَاللَّهُ یُحِبُّ الصَّابِرِیْنَ اللہ ثابت قدموں کو دوست رکھتا ہے وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً یَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا۔ اور ہم نے ان میں ائمہ بنائے جو ہدایت کرتے تھے ہمارے امر سے جبکہ وہ ثابت قدم رہے۔ انبیائے کرام کے حالات پڑھو اس سے معلوم ہوگا کہ ان میں سے ہر ایک نے ایک مدت تک آزمائشیں جھیلیں اور صائب برداشت کئے یہاں تک کہ ان کی استقامت کی پوری آزمائش ہو گئی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد فرمائی۔ چنانچہ فرمایا۔

فَاصْبِرْ کَمَا صَبَرَ

أُولُو الْعِزِّ مِنَ الرُّسُلِ

وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَهُمْ

رکھا کیلئے جلدی نہ کرو۔

یعنی ان پر عذاب یا غلبہ کے لئے جلدی نہ کرو۔

اللہ تعالیٰ کی طریقہ اس پورے کارخانہ کائنات کے اندر نافذ ہے اس نے ہر چیز کے لئے ایک ٹھہرائی ہوئی مدت اور ایک اندازہ کی ہوئی مہلت بخشی ہے تاکہ ہر چیز اپنے مقررہ عروج و کمال کو پہنچے اور اس کے اندر اللہ تعالیٰ نے جو قوی و دعوت فرمائے ہیں وہ تمام ظہور میں آئیں۔ اس لئے وہ ظالموں پر عذاب کرنے میں عجلت نہیں فرماتا بلکہ ان کی مقررہ مدت تک ان کو مہلت بخشتا ہے

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ	ہو اگر اللہ لوگوں سے ان کے کلمہ پر
بِمَا لَسُبُّوا مَا تَزَيَّجَ عَلٰی	(توڑا) عواطف کرتا تو زمین کی پشت پر
ظُهُرِهَا مِنْ دَابَّةٍ وَلٰكِنْ	ایک جاندار بھی نہ چھوڑتا لیکن وہ لوگوں کو
يُخْرِجُهُمْ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّى	ایک عرصہ تک مہلت دیتا ہے پس
فَاِذَا اَجَاءَ اَجَلُ مُّصْرِفَاتٍ	جب جاگنی انکی اجل تو بیشک اللہ اپنے
اللَّهُ كَانَ تَجَبُّدُهُ بَصِيْرًا	بندوں کا نگرانِ حال ہے۔

یعنی جب مقررہ اجل آجائے گی تو اللہ تعالیٰ قانونِ حق کے مطابق ان کا فیصلہ فرما دے گا۔ یہی وہ صبر ہے جو تدبیر و انتظام کائنات کے عالم میں حکم سے تعبیر فرمایا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اکثر مقامات پر صبر کا حکم

فرمایا گیا ہے مثلاً

سَأَلَ سَائِلٌ بِعَذَابٍ
تَأْفِيعٍ لِّلْكَافِرِينَ لِيَكُونَ
لَهُمْ دَافِعٌ مِّنَ اللَّهِ ذِي
الْمَعَارِجِ تَنجِيهِ الْمَلَائِكَةُ
وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ
كَانَ مَقْدُودُهُ خَمْسِينَ
أَلْفَ سَنَةٍ فَأَصَابُوا
صُدُورَهُمْ خَمْسِينَ
يَوْمًا لِّئَلَّا يُعْجِلَ اللَّهُ أَزْوَاجَهُ

ہنگام گئے والے نے واقع ہو گیا اعدا
کافروں کیلئے اس کو کوئی دفع کرنے والا
نہیں ہے آگیا درجوں والے اللہ کی
جانب سے۔ چڑھنے میں اسکی جانب
فرشتے اور روح ایک ایسے دن میں
جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہو پس
صبر کرو، خوبصورتی کے ساتھ۔ وہ
اسکو دور خیال کرنے میں اور ہم
اس کو قریب دیکھتے ہیں۔

حَسْرَتِيْكَ

اگر تم قوموں کی تاریخ پر غور کرو گے، دو باتیں نہایت صاف نظر آئیں گی۔
پہلی یہ کہ خدا کا قانون عدل ہر گوشہ میں جاری و نافذ ہے۔ اور ہر معاملہ کی آخری
گروٹ حق کی طرف ہوتی ہے۔ بَلْ نَقْذِرُ الْبَاطِلَ فَيَلْقَىٰ فَتْدَهُ۔
دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ کا قانون بندوں کے معاملہ میں نہایت علیم ہے وہ ان کو

آخری حد تک مہلت دیتا ہے تاکہ جو کچھ ان کو بخشا ہے اس میں پوری طرح آزمائے کہ وہ کونسی راہ اختیار کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی جہنموں نے کفرانِ نعمت کیا اور تباہ ہو یا ان لوگوں کی جہنموں شکر کیا اور اطاعت کی راہ پر چل کر منزلِ مقصود کو پہنچ فرمایا۔

وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا الْقُرُونِ	اور ہم نے بہت سی قوموں کو تم سے پہلے
مِنْ قَبْلِكَ لَمَّا ظَلَمُوا	ہلاک کیا جبکہ انھوں نے ظلم کیا اور اچکے
وَجَاءَهُمْ رَسُولُهُمْ	ان کے پاس ان کے رسول کھلی
بِالْبَيِّنَاتِ وَمَا كَانُوا	نشانیوں لیکر اور نہیں تھے ایمان
لِيُؤْمِنُوا كَذَلِكَ نَجْزِي	طاہر اور ایسی ہی ہم بدل دیتے ہیں مجرم
الْقَوْمَ الْجَائِرِينَ ثُمَّ	قوم کو بھر بنے بنایا تم کو حق کے بعد
جَعَلْنَكُمْ خَلَائِفَ	جانشین بن کا زمین میں تاکہ کہیں
فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ	تم کی جگہ پر کرتے ہو۔
لَنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ	

اور علم اور صبر دونوں کی اصل ایک ہی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ صبر، حق کی بنیاد ہے پس اگر اللہ تعالیٰ عذاب میں جلدی فرمائے تو وہ حکمتِ باطل ہو جائے گی جس کو وہ ظاہر فرمانا چاہتا ہے اور وہ حق ظہور میں نہ

اسکے گا جو اس تمام کائنات کا خلاصہ ہے چنانچہ فرمایا ہے **وَهُوَ الَّذِي يُخْرِجُ الْخَبْثَ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ**۔ یعنی زمین اور آسمان کی فطرت کے اندر جو مصالح و حکم و ہدایت ہیں ان کو ظاہر فرماتا ہے۔ اس پر ایک حد تک جھٹی اور بارہویں فصل میں ہم روشنی دل چکے ہیں اس میں مزید تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔

حق اللہ عظم دونوں کے مزاج میں کسی قدر نمایاں تفاوت ہے ہایک سرزیا سمجھتی اور باعصاب کا مظاہرہ ہے۔ دوسرا کیسے عفو و درگزر کی خاموشی! لیکن اسکے باوجود تم نے دیکھ لیا کہ وہ دونوں اس طرح ساتھ ساتھ نمودار ہوتے ہیں گویا دونوں بالکل توام ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے ہم کو ان دونوں کا حکم ایک ساتھ فرمایا تاکہ ایک ہی وقت میں ہمارے لئے ہماری باطنی و ظاہری اخلاق کی اصلاح کے دروازے بھی کھول دے اور زمین کی برکت اور آسمان کی تمام نعمتیں اور برکتیں بھی بخندے اور ہم اس راہ پر گامزن ہو جائیں جو بندگی اور خلافت الہیہ کی تکمیل کی راہ ہے اور جو ہمارے اس پروردگار نے کھولی ہے جو عدل اور عفو کو پسند کرتا ہے اور انہی کے ذریعہ اس کائنات کا انتظام فرماتا ہے۔ اس بحث کی پوری تفصیل ہماری کتاب ملکوت الشیخ میں ملے گی۔

سورہ کا تعلق ماقبل و مابعد سے

۱۶۔ سورہ کے موقع اور نظام کی توضیح کے لئے کسی لمبی بحث کی ضرورت نہیں ہے۔

کیونکہ سابقہ سورہ جیسا کہ جان چکے ہو۔ ان اربابِ نعمت کے خسران کے بیان میں ہے جو زخارفِ دنیا کی طلب میں منہمک ہیں۔ اور بعد والی سورہ میں اس عذاب کی تصویر کھینچی گئی ہے جس میں یہ اربابِ نعمت مبتلا ہوں گے۔ پس یہ سورہ ان دونوں سورتوں کے درمیان رکھی گئی تاکہ ان کی آرزوؤں کی نامرادی اور کوششوں کی بربادی پر تنبیہ فرمائی جائے۔ اسی ضمن میں مومنین کے خصائل بتا دئے اور کامیابی کے راستہ کی طرف اشارہ فرمایا اور یہ وہی مقابلہ والا اصول ہے جو قرآن مجید میں بہت عام ہے۔ مثلاً اچھوں کے ذکر کے ساتھ بُروں کا ذکر آتا ہے اور خست کے ساتھ دوزخ کا بیان ہوتا ہے۔

اور اس سورہ کا تعلق ماقبل سورہ سے بالکل ویسا ہی ہے جیسا اس آیت کو

اندر ہے۔

اے ایمان والو! تم کو غفلت میں ڈالیں	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا
تمہارے حال واولاد اللہ کی یاد سے اونچے	لَا تُنْهَكُكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا
ایسا کرے گا تو وہی لوگ گھماٹے	أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَمِنْ
میں ہوں گے اور اللہ کی راہ میں	تَفْعَلْ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ
خسران کر دیں روزی	الْخُسْرَانِ ۚ وَأَنْفِقُوا مِمَّا

دَرَزْنَاكَ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ میں سے جو ہم نے تم کو بخشی ہے اس سے
 أَحَدٌ كَرُمُ الْمَوْتِ فَيَقُولُ رَبِّ پہلے کہ تم میں سے کسی کی موت اس کے
 لَوْلَا آخِرَتِي إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ سربراہ جائے۔ پس وہ کہے اے میری رب
 فَأَصْدَقَ وَكَأَنَّ مَسِيحَ کیوں ندی تو نے مجھ کو کچھ مہلت کہ میں
 الصَّلَاحِينَ ۝ صدرہ کرتا اور بتائیکو کاروں میں سے۔

ان دونوں آیتوں پر غور کر اس سے سورۃ تکاثر اور سورۃ العصر کا باہمی تعلق بالکل
 واضح ہو جائے گا۔ ہذا اولاً محیط بعلمہ وکلماتہ الا ہو۔



سلسلہ دائرہ حمید یہ نمبر ۱۱

تفسیر سورۃ اش

تالیف

استاذ امام مولانا حمید الدین فریدی رحمہ اللہ

ترجمہ

امین احسن اصلاحی

بہ تمام عبدالاحد اصلاحی

اصلاحی پریسیس سیرامیورین چھپی

بکدالہ (۱۹۷۱ء)

قیمت

فہرست مضامین

نمبر شمار	صفحہ
۱	سورہ کا عمود ۲ - ۴
۲	سورہ کا تعلق آگے اور پیچھے سے ۵ - ۴
۳	سورہ کا نظم اور اس کے اجزاء کا باہمی تعلق ۵ - ۸
۴	شہادت کا عمومی پہلو ۸ - ۱۴
۵	معاذ کے ظاہری و باطنی دلائل ۱۴ - ۲۳
۶	معاذ پر ایک تاریخی شہادت ۲۳ - ۲۷
۷	قریش اور ثمود ۲۷ - ۳۱
۸	ایک لطیف اشارہ ۳۱ - ۳۳
۹	ایک اشارہ امت مرحومہ کے باب میں ۳۵ - ۴۱
۱۰	قوموں کے مواخذہ کا قانون ۴۱ - ۴۳
۱۱	امت مرحومہ میں ناقۃ البشر کی مثال ۴۳ - ۴۵
۱۲	حضرت عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کی مثالیں ۴۵ - ۵۰
۱۳	سورہ کے ربط پر دوبارہ نظر ۵۰ - ۵۲
۱۴	ولایتِ نجاف عقبہؓ کی تفسیر ۵۲ - ۵۵

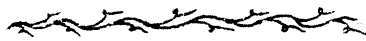
بِسْمِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَالشَّمْسُ وَضُحَاهَا وَاللَّيْلُ إِذَا تَلَّهَا وَالتَّهَامُ إِذَا جَلَّهَا وَاللَّيْلُ إِذَا يَغْشَاهَا وَالسَّمَاءُ وَمَا بَيْنَهُمَا وَالْأَرْضُ وَمَا عَلَيْهَا وَالنَّفْسُ وَمَا سَوَّاهَا خَالِصَةً فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوَاهَا إِذِ انْبَعَثَ أَشْقَاهَا فَقَالَ

شاید ہے آفتاب اور اس کا چڑھنا اور چاند جب اس کے پیچھے لگے۔ اور جب اسے چمکا دے اور رات جب آے ڈھانکے اور آسمان اور جیسا اس کو اٹھایا اور زمین اور جیسا اس کو بچھلایا اور دل اور جیسا اس کو بنایا پس اس کو سمجھ دی بری اور نیکی کی کائنیا ہو جس نے اسے صاف کیا اور ناکام ہو جس نے اسے آلودہ کیا۔ ثمود نے جھٹلایا اپنی سرکشی سے جبکہ ان کا سمجھنا ترین آدمی اٹھ کھڑا ہوا۔ اور پیغمبر خدا

لَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَتَى اللَّهَ وَاسْتَقْبَلَهُ فَكَانَ نَبُوءًا
 فَعَقَّبَهُ وَهَافَكَ هَذَا مَعَهُمْ
 رَسُولُهُمْ يَذُنُّهُمْ فَسَوَّاهَا
 وَلَا يَخَافُ عِقْبَاهَا

ان سے کہا خبردار خدا کی اوتھنی اور
 اس کے پینے کی باری سے۔ سو پینے کو
 جھٹلایا اور اوتھنی کو کاٹ ڈالا۔ تب
 خدا نے ان کے گناہ کے بدلے ان پر
 غضب نازل کیا اور انھیں ناپید کر دیا
 اور وہ نہیں ڈرتا کہ پیچھے کیا ہوگا۔



سورہ کا تھود

- ۱۔ اس سورہ میں قریش اور ان کے بد بخت سردار کے لئے انداز و تحذیر ہے۔ اس لئے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی جو سراسر توحید، ہمدردی اور جبراً کی تعلیمات پر مشتمل تھی، تمذیب کی تھی۔ اور اسلوب بیان اجمال کا ہے کہ تصریح کا۔ یعنی صرف ان کی سرکشی اور ڈھٹائی کا ذکر کیا ہے۔ ان امور کی کوئی تفصیل نہیں فرمائی ہے۔ اور اس کے وجہ ہیں۔
- ۲۔ سورہ مابقی و مابعد میں ان امور کی تصریح موجود تھی۔

۲۔ یہ انور قرآن مجید میں پوری شرح و بسط کے ساتھ بار بار بیان ہو چکی ہیں۔
 ۳۔ اس سورہ کی شہادتیں، جیسا کہ آگے چلکر معلوم ہوگا، ان امور کی تصریح کے لئے کافی ہیں۔ کن بہت ثمود بطغویٰ ہیں اگرچہ ان چیزوں کی تصریح نہیں جن کی ثمود نے تکذیب کی تھی لیکن وہ راز نہیں ہیں کیونکہ ثمود نے حضرت صالحؑ کی تکذیب کی تھی اور ان کی دعوت، توحید، ایمان بالآخرت، اور ہمدردی کی دعوت تھی۔

۴۔ سورہ کا اعلیٰ زور انداز پر ہے اس لئے انداز ہی کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔
 دوسرے مطالب اس کے مقابل میں دب گئے ہیں تاکہ مخاطب کی توجہ منتشر نہ ہو۔ اور کلام کی پہلی تاثیر ان کی سرکشی اور غور کو گھلا سکے۔ چنانچہ صرف ایک ہی بات کا ذکر فرمایا جو ان کی جسارت اور نامرادی دونوں کی جامع تھی۔
 فَقَالَ لَهُمُ الرَّسُولُ اَللّٰهُ نَاقَةٌ اَللّٰهُ وَسُقْيٰهَا فَاَكْبَدُوْهُ فَعَقَرُوْهُهَا۔
 یعنی پیغمبر نے ان کو متنبہ کر دیا کہ اگر انھوں نے سرکشی کی اور اونٹنی کو گزند پہنچایا تو ان پر خدا کا عذاب آدھکے گا۔

پس یہ ایک مثل ہے جو قریش کی تذکیر و تنبیہ کے لئے بیان کی گئی ہے اور جو کچھ وہ اپنے رسول کے ساتھ کرنے والے ہیں اس کے انجام کو ان کے سامنے

پہلے سے رکھ دیا گیا ہے تاکہ وہ آگاہ رہیں۔
یہ اجماعی اشارات ہیں، انکی تفصیل ساتویں اور آٹھویں فصل میں ملے گی۔

سُورہ کا تعلق سے گے اور پیچھے

(۲) سابق سورہ (سورۃ البلد) میں اصحاب الیمینہ اور اصحاب المشرقہ کا ذکر ہوا تھا۔ ”اصحاب المشرقہ“ یعنی وہ لوگ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر پہچانی اور اس کی امانت اور بیت اللہ کے فرائض میں بدعتوں انیاں کر کے بدبختی میں پڑے۔ اس سورہ میں ان لوگوں کے سامنے قوم ثمود کے اس بدبخت ترین انسان کو بطور مثال پیش کیا ہے جس نے اپنی سرکشی کی بدولت پوری قوم کو تباہی کے گڑھے میں ڈھکیلا تاکہ قریش دیکھ لیں کہ وہ بھی اسی بدبخت انسان کی راہ چل رہے ہیں۔ انہوں نے بیت اللہ کے اصل مقصد کو بالکل برباد کر دیا ہے اور آئندہ اپنے رسول کے ساتھ بعینہ ہی معاملہ کرنے والے ہیں جو ثمود نے کیا تھا۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ جس طرح خانہ کعبہ کی بے حرستی ان کی بدبختی اور نادرادی کا سبب ہوئی اسی طرح رسول کی بے حرستی ان کی بربادی کی آخری ساعت ہوگی۔ اس انداز کے بعد سلسلہ سخن مواساة و ہمہ رومی کے ذکر کی طرف متوجہ

ہو گیا ہے اور نہایت اختصار کے ساتھ خدا کی راہ میں خرچ کرنے والے نیکو کاروں اور مال سمیٹ کر رکھنے والے بخیلوں کے احوال و نتائج کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور پھر انہی کے انجام کار کی تفصیل بعد کی سورہ (سورۃ اٰلِیْلِ) میں آئی ہے، جیسا کہ اس کی تفسیر سے معلوم ہوگا۔

سورہ کا نظم اور اس کے اجزاء کا باہمی تعلق

(۳) ان آیات کے باہمی نظم پر غور کرو گے تو معلوم ہوگا کہ اس سورہ میں پندرہ آیتیں ہیں اور ان سب میں جزاء کی شہادت ہے۔ ابتدائی دس آیتیں عام دلائل فطرت میں سے ہیں۔ اور بقیہ پانچ مسلم تاریخی شہادتیں ہیں۔ اور یہ اسلوب قرآن مجید میں عام طور پر پاؤ گے کہ تاریخی دلائل کے پہلو بہ پہلو فطری دلائل بھی بیان ہوتے ہیں اور ان کا اندازہ بیان کبھی قسم کا ہوتا ہے کبھی تحریم کا۔ اور یہ بات ہم اپنی کتاب الامعان فی اقسام القرآن میں بیان کر چکے ہیں۔ کہ قسم کا مقصود دلائل کا بیان ہوتا ہے۔

قسم کے اسلوب پر، دلائل فطرت کے بیان اور پھر ان کے بعد تاریخی شہادتوں کے ذکر کی مثال سورہ فجر میں ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اولاً فجر کی

دس راتوں کی جنت اور طاق کی، اور شب کی (جبکہ وہ ڈہل جائے) کی گواہی پیش کی ہیں۔ اس کے بعد دنیا کی بعض سرکش قوموں مثلاً عاد، ثمود اور فرعون کے احوال و واقعات بطور شہادت سنائے ہیں۔ یہی انداز سورۃ الذاریات میں بھی ہے۔ پہلے دلائل فطرت ہیں، اس کے بعد قوم لوط، قوم فرعون، عاد، ثمود اور قوم نوح کی سرگذشتوں کو تاریخی شہادت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس نظم کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں۔ ایک نئی فنی اسلوب کی عمدہ مثال سورہ سجدہ کی یہ آیت ہے۔

اولم یهدکم کم	کیا ان کو اس بات سے ہدایت نہ
اهلکنا من قبلہم من	ہوئی کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی امتیں
الفرعون یمشون فی	ہلک کر ڈالیں جنگی جہتوں میں یہ جلتے
مساکنہم ان فی ذلک	پھرتے ہیں۔ بیشک اس میں نشانیاں
لآیتہ افلا یسمعون	ہیں (جزائر، عدل، اور قدرت الہی کی)
اولم یروا اننا نسوق	تو کیا یہ لوگ سنتے سمجھتے نہیں (یہ واقعات)
الماء الی الارض فیرز	کیا انہوں نے نہیں دیکھا (یعنی اگر نہ)
فخرج بہم زرعنا کل	نہیں تو کیا دیکھا بھی نہیں کہ ہم بادیوں کو

وَسَقَرٌ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ
مِّنَ الْأَنْبَاءِ مَا فِئَهِمْ
حِكْمَةٌ بِاللِّغَةِ فَمَا لُغْنِ
الْأُنْدُسُ

تسین ہے اور ان کے پاس اتنے
حالات پہنچ چکے ہیں جنہیں کافی تہذیب
بھر پر حکمت۔ پس ڈراوے کیا
نفع دیتے ہیں۔

ان کے علاوہ اور مختلف سورتوں میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ یہ آیتوں
عام ہے۔ البتہ اس امر پر غور کرنا ہوگا کہ آفتاب و مانتاب، رات اور دن، اور
زمین و آسمان کی گواہی یہاں کس بات پر پیش کی ہے۔ اور اس کے پہلو کیا ہیں؟
پہلے ہم اس اسلوب پر ایک عمومی نظر ڈالیں گے۔ اس کے بعد شہادت کے پہلو
بے نقاب کریں گے۔

شہادت کا عمومی پہلو

(۴) اس کائنات کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی صفات
میں سے کسی نہ کسی صفت کا جلوہ نہ ہو۔ **وَإِنْ مِّن شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ**
نہیں ہے کوئی چیز مگر اس کے حمد کی تسبیح پڑھتی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی صفات
حسی کی گواہی دے رہی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا دستور یہ ہے کہ وہ عموماً صرف اپنی بڑی بڑی

نعمتوں کو یاد دلاتا ہے کیونکہ انسان ان سے اسی حال میں انکار کر سکتا ہے جب بالکل اندھا بہرا ہو جائے۔ چنانچہ قرآن مجید میں بالعموم اپنی قدرت و حکمت کی ایسی ہی ابھری ہوئی نشانیوں کا حوالہ دیا ہے جن کو ہر احساس رکھنے والا وجود بغیر کسی کاوش کے پالیتا ہے، مثلاً سورج، چاند، رات، دن، آسمان، زمین۔ اور کبھی کبھی چھوٹی نشانیوں کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے تاکہ معلوم ہو کہ اس کی نشانیاں بے شمار ہیں، ان کو کوئی گن نہیں سکتا۔

قرآن مجید کا عام انداز استدلال یہ ہے۔

إِنِّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ	بیشک آسمانوں اور زمین کی خلقت
وَالْأَرْضِ وَخِلْقَةِ	اور رات اور دن کی گردش میں نشانیاں
النَّجْلِ وَالنَّهَارِ لَا يَتَّ	ہیں عقل والوں کے لئے پابنا۔
لَاُولَىٰ لَآلِبَابٍ لِّدِينِ	جو اللہ کو یاد کرتے ہیں کھڑے اور بیٹھے
يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا	اُٹھتے اور آسمان اور زمین کی خلقت میں
وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ	غور کرتے ہیں (اور پکاراٹھتے ہیں) اے
وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ	ہمارے رب یہ کارخانہ تو نے بے تیجہ نہیں
السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ	بنایا ہے (یعنی اس کارخانہ کائنات کے اندر

کی جو نشانیاں ہیں ان سے اپنی توحید پر استدلال کیا ہے۔

وَالْهٰكُمُ الْاِلٰهُ وَاحِدٌ	اور تمھارا معبود ایک معبود ہے نہیں
لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ	ہے کوئی معبود مگر وہ رحمن و رحیم بیشک
الرَّحِيْمُ اِنَّ فِيْ خَلْقِ	آسمانوں اور زمین کی خلقت میں
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ	اور رات اور دن کی آمد و شد میں
اِخْتِلَافِ النَّهَارِ	اور کشتیوں میں، جو لیکر چلتی ہیں سمندر
وَالْفَلَاحِ اَلَّتِيْ تَجْرِيْ فِيْ	میں لوگوں کے فائدے کی چیزیں
الْبَحْرِ يَمَّا يَنْفَعُ النَّاسَ	اور پانی میں جو اللہ نے آسمان سے
وَمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ	اتار ا پس اس کے ذریعہ زندہ کیا زمین
السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَاٰحْيَا	کو اسکی موت کے بعد اور پھیلانے اس
بِهَ الْاَرْضَ اَرْضًا بَعْدَ مَوْتِهَا	اس میں ہر قسم کے جانور اور ہواؤں
وَبَتَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ اَبَّةٍ	کی گردش میں اور بادلوں میں جو
وَتَصْرِيفِ الرِّيَّاحِ وَ	آسمان اور زمین کے درمیان بند ہے
السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمٰوِ	ہوئے ہیں، نشانیاں ہیں ان لوگوں
وَالْاَرْضِ اٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ	کیلئے جو عقل رکھتے ہیں (اس استدلال

اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک مناظرہ نقل کیا ہے جو ان کے اور ایک کافر بادشاہ کے درمیان ہوا ہے اور جس میں انھوں نے آفتاب کی تیز سی اندلا کر کے حریف کو بحث میں بالکل عاجز و درماندہ کر دیا ہے۔

پھر قرآن مجید نے دلیل کے اعتبار سے ان کو بعض اشارات و کنایات کا رتبہ نہیں دیا ہے، بدیہیات اور یقینیات کا درجہ بخشا ہے۔ ایک جگہ آسمان و زمین کی خلقت کو توحید اور جزاء کی دلیل کے طور پر بیان کرنے کے بعد فرمایا ہے۔

فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنْذَرْتُكُمْ
صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ
عَادٍ وَثَمُودَ
پس اگر وہ اعراض کریں تو کہہ دو کہ
میں تم کو ڈراتا ہوں کہ کڑک سو جو عادی
ثمود والی کڑک کی طرح ہوگی۔

یعنی یہ ہیں جو ان کو ساقی لگئی واضح ترین حجت ہے۔ اس کے بعد اعراض و انکار کیلئے کوئی گنجائش نہیں رہ گئی ہے۔ اگر اس کو بھی وہ نہیں مانتے تو معلوم ہوا کہ ان کا اعراض و دلیل کے خفا و اور معاملہ کی عدم وضاحت کی وجہ سے نہیں ہے، شرارت اور سرکشی کی وجہ سے ہے۔ اور جن لوگوں نے یہ حالت اختیار کر لی ہو، ان کیلئے اب صرف یہ بات باقی رہ گئی ہے کہ ان پر عادی و ثمود والا عذاب نازل ہو۔ قرآن مجید اس پہلو کی مثالیں بکثرت ہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ آفتاب و مہتاب کی گردش روز و شب کی آمد و شد زمین و آسمان کی خلقت اور ان کے عجائب میں توحید و رحمت، عدل و جزا اور بخت کی بے شمار نشانیاں ہیں۔ اوپر ہم نے اس مسئلہ کے بعض پہلوؤں کی توضیح کی ہے۔ اور آئندہ فصل میں انشاء اللہ اس کی مزید توضیح ملے گی۔

معاذ کے ظاہری و باطنی دلائل

۵۔ آفتاب و مہتاب وغیرہ کی دلالت، ان امور پر جن کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ ایک خاص پہلو توجہ دلانے کے قابل ہے اور اس وقت ہم بالاجمال اسی کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

غور کرو تو معلوم ہوگا کہ اس سورہ میں مقابلہ کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو شہادت میں پیش کیا ہے، ان کو تنہا حالت میں نہیں پیش کیا ہے۔ ان کے مقابل اور چوڑنے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ سورج کے ساتھ چاند ہے، رات کے ساتھ دن ہے، آسمان کے ساتھ زمین ہے و لم حربا و قرآن مجید کی تصریح سے یہ بات ہم کو معلوم ہے کہ اشیاء کے چوڑے جوڑی پتھریں ہمارے لئے بے شمار دلائل حکمت پنہاں ہیں۔ فرمایا ہے۔

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ
لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ فَفَرَّقُوا
إِلَى اللَّهِ اِتِّى لَكُمْ مِنْ دَنِّ
مُبِينٍ وَلَا تَجْعَلُوا مَعَ
اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ اِتِّى لَكُمْ
مِنْ دَنِّ يُؤْمِنُونَ

اور ہر چیز سے ہم نے بنایا جوڑا، تاکہ تم یاد دہانی
چاہل کرو (یعنی وہ خالق حکیم ہی جو ہر وجود
کو اسکے جوڑے کیلئے موزوں اور سازگار بناتا
ہو افسوس کہ قابو رکھتا ہی پس بھاگو اللہ
کی طرف، بیشک میں تمہارے لئے اسکی طرف سے
کھلا ہوا ہوشیار کریم والا ہوں (وہی تمہارا
رب اور چوچا اور اسی کی طرف تم کو لوٹنا ہے)
اور نہ بناؤ اللہ کی مانند کوئی دوسرا وجود
بیشک میں تمہارے لئے اسکی طرف سے کھلا ہوا
ہوشیار کریم والا ہوں، (یعنی وہی تمہارا
پروردگار ہے)

دوسری جگہ فرمایا :-

وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَىٰ وَالنَّهَارِ
إِذَا تَجَلَّىٰ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ
وَالْأُنثَىٰ إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّىٰ

شام کی رات جب ڈھلے ہو رہی جب
روشن ہو اور نہروادہ کی آفرینش کہ تمہاری
کوششیں مختلف ہیں۔

اس کے آگے اس سنی مختلف کا بدلہ بیان فرمایا ہے۔ اب غیر کرو اس کلام کا سیاق ہم کو اس تقابل کی طرف کس طرح متوجہ کر رہا ہے، جو اس نظام کائنات کے ہر گوشہ میں موجود اور اس تمام سنی و عمل کے ہنگامہ کا اصلی محرک ہے اور جو خود ہمارے نفس کی تربیت کے لئے بھی ناگزیر ہے۔ کیونکہ نفس انسانی کا تمام شرف و کمالات اس ریاضت پر مبنی ہے جو اس کو دوبالکل متضاد میلانات کی کشاکش کے اندر کرنی پڑتی ہے۔ تفصیل اس اجمال کی طولانی ہے، البتہ بعض اشارات تفسیر سورہ تین میں ملیں گے۔

یہاں ہمارے پیش نظر بحث کا صرف اتنا حصہ ہے جتنا اس سورہ سے تعلق رکھتا ہے۔

اس کائنات کی ہر چیز غور سے دیکھو، ایک پہلو سے بالکل کامل اور مستقل ہے۔ دوسرے پہلو سے ناقص اور محتاج۔ اور اس میں جن و حکمت کا اصلی جمال اس وقت نمایاں ہوتا ہے جب وہ چیزیں باہم جبر کر اپنے اس نقص و احتیاج کے خلا کو پُر کر لیتی ہیں۔

پھر ذرا اور گہری نظر سے دیکھو گے تو تمہیں نظر آئے گا کہ یہ دنیا متضاد عوامل اور متقابل قویٰ کی ایک رزمگاہ ہے۔ یہاں زندگی اور موت، تخریب اور تعمیر کی ایک باہمی آویزش ہر گوشہ میں سرگرم کار ہے۔ جن کی نگاہیں تہ تک پہنچنے کی عادی نہیں ہیں وہ اس حالت سے دہوکا کھاتے ہیں۔ اور سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ دنیا مختلف لانوائمن اور جنگ جو دیوتاؤں کا ایک اکھاڑہ ہے۔ یہی مقام ہے جہاں مجوس کو کھوکھو کر لگی او

پھر ہمیں سے مختلف بت پرست قوموں نے بہت سے ایسے عقائد و نظریات ٹھہرائے جو بعض اعتبارات مجوس کی عقلاتوں سے بھی زیادہ سخت و شدید ہیں۔ حالانکہ یہ ٹھوکر محض فکر و نظر کی کرتا ہی سے لگی۔ جن کی نگاہیں کشاکش اور تضادم کے ان ظاہری مناظر سے گزر کر ان حکم و مصالح تک پہنچ گئیں جو اس تضادم کے اندر پوشیدہ ہیں۔ ان کو یہ حقیقت صاف دکھائی دی کہ اس دنیا کی خالق صرف ایک قادر و قیوم ذات ہے اگر وہ ذات ایک نہ ہوتی تو دو متضاد قسم کے عناصر اور قوی کی کشمکش کے اندر آسمان و زمین کا تمام کارخانہ درہم برہم ہو جاتا۔ کہ قال :-

لَوْ كَانَتْ فِیْهِمَا إِلَٰهَةٌ ۖ
إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا ۚ

اگر ان دونوں کے اندر (آسمان و زمین)
اللہ کے سوا (اللہ واحد) اور بھی موجود ہوتے تو یہ

دونوں درہم برہم ہو جاتے۔

وَمَا اتَّخَذَ اللَّهُ مِنْ
وَلَدٍ وَمَا كَانَ مَعَهُ
مِنْ إِلَٰهٍ إِذْ أَكَّٰنَ هَبْكُلُّ
إِلَٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَّا
بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ

اللہ نے اپنے لئے کوئی اولاد نہیں بنائی اور
نہ کوئی معبود اس کا ساتھی ہوا اور اگر یہ بات
ہوتی تو ہر مہم اپنی مخلوق کو لیکر الگ الگ سمجھتا
اور ایک دوسرے پر چڑھائی کرتا۔

پس اس کائنات کے اندر قویٰ اور عوامل کا جو تضاد م ہے، نگاہ کو اس پر
 ٹھہر نہیں جانا چاہئے۔ ان مصالح تک نفوذ کرنا چاہئے جو اس تضاد سے پیدا ہوئے
 ہیں۔ اس وقت نظر آئے گا کہ اس آسمان کے نیچے ہر چیز جوڑوں کے اتصال و تعلق
 سے وجود میں آتی ہے۔ اور تمام مصالح و فوائد کا سرچشمہ تضاد و متضاد قوی کا وجود جو
 قانون قدرت یوں ہے کہ دو چیزیں آپس میں ٹکرا کر اپنے سے ایک بالاتر حقیقت
 کو وجود میں لاتی ہیں۔ اس کارخانہ کے اندر شرمض کا وجود نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ
 غیر مطلق ہے جن و خوبی کی تمام صفیتیں اور کمال و کبریائی کی تمام عظمتیں صرف اسی
 کیلئے مخصوص ہیں۔ پس اس دنیا میں جو چیزیں ہمیں بظاہر متضاد نظر آتی ہیں وہ درحقیقت باہم مددگار
 ہیں۔ اس پوری دنیا کو اس کی مجموعی حالت میں دیکھو۔ یہ مختلف اجزاء و عناصر
 اور متضاد قویٰ اور عوامل کی ایک نہایت دل فریب اور حسین وحدت ہے اور یہ تمام
 متضاد حالتیں زمین و سیارہ آسمان و زمین، سردی اور گرمی، خوشی اور رنج، نیکی
 اور بدی اسی وحدت کے احوال و ماحول ہیں۔ اب اس کو دوسرے سادہ لفظوں
 میں اجمال کے ساتھ یوں بھی سمجھ سکتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی بعض مخلوقات کو بعض
 کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ مثلاً اعلیٰ کو معلولات کے ساتھ، طبائع کو ارادات کے ساتھ،
 قویٰ کو آلات کے ساتھ، جملہ کائنات کے ساتھ، اہل کو جزا کے ساتھ اور دنیا کو آخرت کے ساتھ۔

فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ
الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تَنْتٰ
الْاَرْضَ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ
وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ

پس پاک ہے وہ ذات جس نے پیدا
کے تمام جوڑے نباتات زمین کی قوم میں سے
اور مردان کے اندر سوا اور ان چیزوں کے
اندر سے جن کو وہ نہیں جانتے۔

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ یہ قانون کس قدر ہمہ گیر ہے۔ اور اس پر
حقد ر غور کرو اسی قدر اللہ تعالیٰ کی عظمت اور رحمت بے نقاب ہوتی ہے۔ اور
ہم کو تسبیح و تحمید کی دعوت دیتی ہے۔

لیکن جنہوں نے اس دنیا کی حقیقت کو صرف اس کی اکہری حالت میں
دیکھا ہے، دوسری حالت میں نہیں دیکھا۔ یعنی جوڑے کے صرف ایک فرد پر نگاہ
پڑی، دوسرے فرد کو نہ دیکھ سکے۔ ان پر اس کائنات کا اصلی حسن و جمال بے نقاب
نہ ہو سکا۔ وہ طرح طرح کی خرابیوں میں پڑ گئے۔ اور ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ اور جو صرف
دنیا کو دیکھے گا اور آخرت پر اس کی نگاہ نہ پڑے گی۔ اس کو یقیناً دنیا نہایت مکروہ
بد منظر اور ہولناک صورت میں دکھائی دے گی اور وہ اس معاملہ میں سخت متردّد
ہوگا کہ اس کی خالق کوئی ایسی ذات ہے، جو حکیم و رحیم ہے کیونکہ دنیا میں ظلم و معصیت
کے دشتناک مناظر ہیں وہ کسی طرح بھی اس کے دل کو اس بات پر چھینے نہ دیں گے۔

اس معاملہ کی پوری تفصیل دوسری سورتوں میں ملے گی۔ یہاں اس سے زیادہ پھیلنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اس تہید کو سمجھ لینے کے بعد ”وَاسْمٰی“ سے لیکر ”دَسْتُوکَا“ تک کی تفسیر پر غور کرو گے تو تمہیں یہ بات نظر آئے گی کہ جو نظام اس عالم جہانی میں قائم ہے بعینہ اسی طرح کا نظام عالم روحانی کے اندر قائم ہے۔ مثلاً اس نظام جہانی کے دو جانب ہیں۔ روشنی اور تاریکی، بلندی اور پستی اور ہر جانب کے ساتھ اس کائنات کی ایک خاص مصلحت وابستہ ہے اور ان دونوں جانبوں کے اجتماع سے انسان کی پرورش اور قدامت و بہبود کے گونا گوں پہلو ظہور میں آتے ہیں۔ قدرت نے زمین کو ایک فرش بنایا اور اس پر انسان کی معیشت کے لئے طرح طرح کی نباتات اگادیں۔ اور رات کو ڈھانک کر پر سکون بنایا اور اس میں اس کے لئے راحت و خوش عیشی کا بستر بچھا دیا۔ بالکل یہی حال عالم روحانی کا ہے اس میں بھی مین و آسمان اور رات اور دن ہیں۔ اور ان دونوں کی تدبیر سے روح کی ترقیاں اور کامیابیاں ظہور میں آتی ہیں اور یہی مقام ہے جہاں ہنچکر انسان پر خدا کی مکت و رحمت اور اس کی حکومت قاہرہ کے کچھ اسرار منکشف ہوتے ہیں۔

تَبَارَكَ الَّذِي جَعَلَ فِي
الْسَّمَاءِ بُرُوجًا وَجَعَلَ فِيهَا
مِرَاقًا بَرَكْتَ هُوَ ذَاتُ جَبَرُوتِ
آسمان میں برج اور دکھلا میں چراغ

سِرَاجًا وَقَمَرًا مُنِيرًا هُوَ
اور روشن چاند اور دسی ہر جس نے بنایا
الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ
رات اور دن کو آگے پیچھے آنی والا
وَالنَّهَارَ خَلْفَةً ۚ لَمْ يَرَأِدْ
اس کے لئے جو چاہے یاد دہانی حاصل
اَنْ يَنْتَكِرَ كَوْنًا وَاَرَادَ شُكُورًا
کرنا یا چاہے شکر کرنا۔

”جو چاہے یاد دہانی حاصل کرنا۔ یعنی اس امر کو یاد کرنا چاہے کہ اس کا نانا
ہے ایک خالق و مدبر اور پروردگار ہے۔ یا چاہے شکر کرنا“ یعنی
اس امر پر کہ اللہ تعالیٰ نے اس تمام کارخانہ کو رحمت کے محور پر چلایا ہے۔ سورہ
رعد کی آیات (۲-۵) میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے۔ اِنَّهُ الَّذِي فَرَضَ
الْمَسْمُوعَاتِ بِغَيْرِ عَمَلٍ تَرَوْنَهَا (الہی قولہ تعالیٰ) لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ۔
ان آیات کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ نظام کائنات کے اس اہول
پر ہونے کا اصلی مقصد ہمارے نفوس کی اصلاح و تربیت ہے۔ چنانچہ کائنات کی
حالت کے بالمقابل نفس کی حالت بیان کی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مادی
دنیا کو اللہ تعالیٰ نے تاریک اور روشن اور پست و بلند بنایا تاکہ نفس انسانی کیلئے
ایک آئینہ ہو اور جو حقیقت اس کو اہم کی گئی ہے وہ اس مادی مثال سے اس کے
اند پروری طرح راسخ ہو جائے۔ اور اس کو ظاہری اور باطنی دونوں قسم کی نشانیوں

مل جائیں پس پہلے دلائل آفاق بیان کئے، پھر بالکل ٹھیک ٹھیک اسی کے مطابق دلائل انفس کی طرف اشارہ فرمایا تاکہ ہم سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ خالق و حکیم اور مدبر ہے۔ اور پھر یہاں سے توحید و معاد کی معرفت کا دروازہ کھلے چنانچہ ایک مقام میں فرمایا:-

وَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْأَفَاقِ
وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ
لَهُمْ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ
اور ہم ان کو دکھاتے ہیں اپنی نشانیاں
آفاق میں اور ان کے نفوس کے اندر
تاکہ ان پر ظاہر ہو جائے کہ وہی حق ہے۔

پھر اس کے بعد نفوس کی حالت اور اس کے الہام کا ذکر فرمایا جو درحقیقت حیات کی ایک نہایت واضح دلیل ہے کیونکہ اگر جزا نہیں ہے تو فوراً تقویٰ کیا معنی؟ فوراً وہ چیز ہے جو فطرت کے مخالف ہو اور جس کا ارتکاب خدا کی نافرمانی کا باعث ہو اور تقویٰ نفوس کی طہارت اور خدا ترسی کو کہتے ہیں۔ اس الہام سے مراد وہ بندگی اور ذمہ داری ہے جس کو ہر انسان اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ سورہ قیامہ کی تفسیر میں اس کے متعلق بعض اشارات گزر چکے ہیں۔ یہ الہام اس امر کی نہایت واضح دلیل ہے کہ ہمارا خالق ایک ایسی ہستی ہے جو ہمارے اعمال کے مطابق ہم کو بدلہ دے گی۔ قیامت کے وقوع پر یہ ایک فطری شہادت ہے اور ہمارے نفس کے لئے اس شہادت سے بڑھ کر کوئی شہادت نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ خود ہمارے

اندر سے بول رہی ہے لیکن جن کے کان اس عالم محسوسات کے ہنگاموں نے بھر کر دیئے ہیں وہ اس شہادت سے بے خبر ہیں۔ اس وجہ سے قرآن نے متوجہ کرنے کے لئے پہلے عالم آفاق کی شہادتیں پیش کیں اور آفتاب و ماہتاب، روز و شب اور آسمان و زمین کا ذکر کیا۔ اس کے بعد تدریجاً عالم نفس کی بعض گواہیاں پیش کیں اور سب سے آخر میں ایک تاریخی شہادت پیش کی جو مخاطب کے نزدیک بالکل مسلم تھی گویا یہ شہادت کی ایک تیسری قسم ہے جو آفاقی و انفسی دونوں طرح کے دلائل کی جامع ہے۔ آگے ہم بالا جہاں اس پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

معاذ پر ایک تاریخی شہادت

۶۔ اہل عرب جن قوموں سے اچھی طرح واقف تھے انہی کے حالات کو اللہ تعالیٰ نے گواہی میں پیش کیا ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ گذشتہ شہادت کے الفاظ سے جیسا کہ ہندو تصور ہمارے ذہن میں قائم ہوتا ہے ویسا ہی اہل مکہ کے ذہن میں بھی قائم ہوتا ہوگا؟ نہیں۔ اس سورہ کے چند مختصر لفظوں میں ثمود کے متعلق جو اشارات کئے گئے ہیں، وہ اہل عرب کے سامنے ثمود کی پوری تاریخ اُٹھنے کر دینے کے لئے بالکل کافی تھے۔ ثمود عرب بائدہ میں سے ہیں جن کی بستیوں اور جن کے

چرچے اہل عرب نے وراثت میں پائے تھے۔ اور جن کے متعلق ان کی روزمرہ کی گفتگوؤں میں مختلف قسم کی شبلیں پھیلی ہوئی تھیں۔ قرآن مجید ہمارے اس بخیر پر سب بڑی حجت ہے۔

(۱) وَعَادًا وَتَمُودًا وَقَدْ

اور عاد اور ثمود اور تم کو ان کی بستیوں

معلوم ہیں۔

تَبَيَّنَ لَكُم مِّنْ مَّسَاقِينِ
(۲) اَنَّا دَمَّرْنَا هُمْ وَقَوْمَهُمْ

بیشک ہم نے انکو اور انکی پوری قوم کو

نباہ کر دیا پس ان کے ڈھکے ہوئے مکانات

ہیں ان کے ظلم کے باعث بے شک

ان میں نشانی ہے ان لوگوں کے لئے

جو علم رکھتے ہیں۔

اَجْمَعِينَ فَبَلَكَ بُيُوتُهُمْ

خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوا اِنَّ

فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ

يَعْلَمُوْنَ

اور تم بے ان لوگوں کے مکانوں میں

جنہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور تم کو معلوم

ہے کہ ہم نے ان کے تھاکیسا معاملہ کیا اور

ہم نے تمہارے لئے مثالیں بیان کیں۔

(۳) وَسَكَنْتُمْ فِيْ مَسَاكِنِ

الَّذِيْنَ ظَلَمُوا اَنْفُسَهُمْ

وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا

بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ

شعرا نے بھی ان کا ذکر اسی حیثیت سے کیا ہے۔ ابو زبید طائی کہتا ہے۔

من رجال كانوا جملًا نَجْمًا فهم اليوم حسب ال ثَمُو
 ثمود عاؤ کے بقایا میں سے ہیں یہی وجہ ہے کہ بعض شعرا کبھی کبھی ان کا ذکر اس
 طرح کرتے ہیں کہ وہ دونوں قوموں کو ایک کر دیتے ہیں۔ آگے زہیر بن ابی سلمیٰ
 کا ایک شعر اس مطلب کا ملے گا۔ یہ لوگ اپنی قوت و صولت میں ضرب المثل
 تھے۔ خداؤ نے کہا ہے

ولا قادم الايام يوم لما من قبل لم يخلد قدار

اور اس کی گردش روزگار نے فنا کر دیا جس طرح اس سے پہلے قدار کو دوام نہیں حاصل ہوا
 شعریں قدار سے مراد آخر ثمود ہے جس نے اوستنی کو گزند پہنچایا تھا۔ جس طرح
 عاد میں قبل بن عرکذر رہے۔ اسی طرح قوم ثمود کا یہ نہایت سرکش اور طوق العنان سردا
 تھا مشہور جاہلی شاعر افوہ اودی نے ایک قصیدہ میں اپنی قوم کے پاجیوں کی مہمت
 کرتے ہوئے ان کو قبل و قدار سے تشبیہ دی ہے۔

فذا معاشر لم يبنوا القوم وان بنى قومه ما احسد

جس کی کچھ ایسا نثر میں جنوں نے اپنی قوم کیلئے کچھ بنایا نہیں اور اگر انکے گاڑے ہوئے قوم نے بنایا تو انھوں نے اس کو پھر بگاڑ دیا

لا يمشدون دلي برعوا لم يمشدون والجمل منهم معا والحق ميعاد

نہ خود راہ دکھاتے اور نہ راہ دکھانے والی سنتے، بہالت اور سرکشی دونوں ان میں ساتھ ساتھ ہیں

اَضْحَوْا كَقَبِيلِ بْنِ عَمْرِو بْنِ عَشِيرَتِهِ اِذَا هَلَكَتِ بِاللَّذَى سَلِمَ لَهَا عَادُ
انکا حال وہی ہو جو قبیل بن عمر کا اپنی قوم کے اندر تھا کہ اسکی کثرت کی بدولت عادی ہلاک ہوئے۔

اَوْ بَعْدَ لَا كَقَدْرِ حِمِينَ تَابِعُوهُ عَلَى الْغَوَايَةِ اقْوَامٌ فَقَدْ بَادُوا
یا اس کے بعد قرار کا جس کی لوگوں نے گمراہی میں پیروی کی اور ہلاک ہوئے۔

واقعات کی شہادت چونکہ محسوس ہوتی ہے اور ان کی تفصیلات تو اتر کے ساتھ
آدمی سنتا ہے اس لئے قدرتی طور پر طبیعتیں ان سے زیادہ متاثر ہوتی ہیں۔ پھر اپنی نفس
پر خواہشوں کے اتنے پروے ہوتے ہیں کہ اپنے اعمال کی برائی اس کو نظر نہیں آتی۔
لیکن برائی سے نفرت ایک فطری بات ہے اس لئے دوسروں کے حالات سے
وہ عبرت حاصل کرتا ہے۔

ہم نے ان شہادتوں کے متعلق کہا ہے کہ یہ آفاقی و انفسی دونوں طرح کے
دلائل کی جامع ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے نفوس کے ساتھ اعمال کے مطابق
جزا دینے کا جو معاملہ اللہ تعالیٰ نے کیا ہے ان شہادتوں کے اندر ان کا ہر پہلو موجود ہے
ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے محقق الامام فرمایا اسکے بعد جھڑکی اور دھکی
دیکر ہوشیار کیا پھر اپنی اس جھڑکی اور دھکی کے آثار و نتائج یعنی ان کی ڈھکی ہوئی
بیتوں کو بعد میں آنے والوں کے لئے سرمایہ عبرت بنا کر محفوظ کر دیا کہ وہ دیکھ سکیں کہ

ان کے اگلوں کے ساتھ ان کی شرارت پر کیا معاملہ ہوا۔ پس ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر غور کرو تو معلوم ہو گا کہ ان کے اندر آفاقی و انفسی دونوں طرح کی دیلیں جمع ہو گئی ہیں۔

قریش اور ثمود

۴۔ دوسری فصل میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس سورہ میں قریش کے لئے ایک عام انداز و تخیلیت ہے اور روئے سخن خصوصیت کے ساتھ ابولہب کی طرف ہے۔ اب تھوڑی دیر توقف کر کے اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ قریش اور ثمود میں مناسبت کیا ہے؟

یہ معلوم ہے کہ قریش تمام عرب کے سردار تھے اور ان کے منصب کی عظمت اور ان کی عام ذہنی بلندی نے پورے ملک میں ان کو ایک نہایت نمایاں توفیق اور برتری کی جگہ دیدی تھی اور عرب کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی حیثیت کسی زمانہ میں ثمود کو بھی حاصل تھی، ثمود عاد کے بقایا میں سے ہیں اور ان کی تمدنی اور صنعتی برتری اس درجہ سلم تھی کہ عرب ان کے تمدنی آثار کی مثالیں دیا کرتے تھے۔ خود قرآن مجید ان کا ذکر ایسے انداز سے کرتا ہے جس سے ہمارے بیان کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔

وَعَادًا وَثَمُودًا وَقَدْ
 تَبَيَّنَ لَكُم مِّنْ مَّسَاجِدِكُمْ
 وَرَيْنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ
 اَعْمَا لَهُمْ فَوَّضَهُمْ
 عَنْ سَبِيلِي وَكَانُوا
 مُنْتَبِضِينَ

اور ہم نے ہلاک کیا عاد کو اور ثمود کو
 اور تم کو ان کی بستیاں معلوم ہیں اور
 شیطان نے انکی نگاہوں میں ان
 عملوں کو اچھا کر دکھایا تھا پس روکنا
 ان کو اللہ کے راستہ سے حالانکہ وہ
 بڑے کارواں تھے۔

سورہ فجر کی تفسیر میں ہم ان کی تمدنی ترقیوں کے بعض دلائل کلام عرب کی
 تأییدات کے ساتھ نقل کر آئے ہیں، جو مناسبت قریش اور ثمود میں ہے۔ اس سے
 زیادہ گہری مناسبت ان دونوں قوموں کے سرداروں میں ہے۔ قریش کے ابو
 اور ثمود کے قدار کے حالات پر غور کرو تو تم کو نظر آئے گا کہ بالکل ایک ہی چیز دو
 بھیسوں میں دو جگہ نمودار ہو گئی ہے۔ یہ دونوں بد بخت ترین خلائق تھے۔ دونوں
 اپنی اپنی قوموں کے سردار تھے اور بالآخر دونوں نے اپنی جماعتوں کو ہلاکت کے
 گڑھے میں گرایا۔

عرب میں سیادت و قیادت کی تمام عظمت خانہ کعبہ کے ساتھ وابستہ تھی۔
 اسکی تولیت ابوطالب کے بعد ابوہب کو منتقل ہوئی۔ اور اس طرح تمام عرب

کی قیادت کی باگ اس کے قبضہ میں آئی۔ اس نے بیت اللہ پر قبضہ کرنے کے بعد اس کے بنیادی مقاصد، دعوت توحید اور ہمدردی فقراء و ضعیفاء، میثاق بر باد کر دیے۔ تیموں کو دھکے دینے لگا، مسکینوں کو دھکے مارنے لگا، نماز اور ذکر الہی، جس سے اس گھر کی اصلی رونق و آبادی تھی ختم کر ڈالی۔ اور سرکشوں اور نافرمانوں کے جھٹکا سردار بن بیٹھا۔

پھر جب اسے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلعم نے اسکی بدعات و شرارتوں کے خلاف آواز اٹھائی ہے تو اس کو اپنی سرداری کے زوال کا خطرہ محسوس ہوا، اور بجائے اسکے کہ اپنی اصلاح کرتا، اس نے آنحضرت صلعم سے جنگ و پرخاش شروع کر دی اور قریش کے تمام سرکشوں کو آپ کی عداوت پر متحد کر لیا۔ سورہ لمب اور سورہ ماعون کی تفسیر میں ہم اسکی بعض خصوصیات بیان کر چکے ہیں۔ یہاں زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ گوناگوں منابعتیں تھیں جنکی وجہ سے قرآن نے ثمود اور انکے سردار قدار کو قریش اور ان کے سردار ابولہب کے سامنے بطور مثال اور نمونہ عبرت کے پیش کیا، تاکہ ان کو معلوم ہو جائے کہ جو راہ وہ چل رہے ہیں وہ بعینہ وہی راہ ہے جو ان سے پہلے دوسری گمراہ قومیں چل چکی ہیں اور جس کا انجام بالآخر تباہی ہے اسی مقصد سے قرآن نے اہم سابقہ میں سو اور بت سی قوموں کے حالات

قریش کو سنائے ہیں تاکہ وہ ان حالات کے اندر خود اپنے حالات و انجام کو دیکھ لیں اور اسی کے ساتھ ان کو یہ بات بھی بتا دی گئی کہ اب وہ خدا کے عذاب کے پوری طرح مستحق ہو چکے ہیں لیکن نبیؐ اور مومنین کے ایمان کی برکت کی وجہ سے ابھی وہ اسکی زد سے محفوظ ہیں۔ جس روز یہ امان اٹھ جائے گی، یعنی پیغمبرؐ اپنی جماعت کے ساتھ ان کو چھوڑ کر ان سے الگ ہو جائے گا، عذاب الہی اُدھکے گا۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

وَمَا كَانَتِ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ
اور اللہ کو زیبا نہ تھا کہ وہ ان کو عذاب

وَاَنْتَ فِيهِمْ وَمَا كَانَتِ
دیتا در انحالیکہ تم ان کے اندر موجود تھے

اللّٰهُ مُعَذِّبُكُمْ وَهُمْ
اور نہیں تھا اللہ ان کو عذاب دینے والا

يَسْتَغْفِرُونَ
در انحالیکہ وہ اپنی گنہگاروں کی معافی

چاہتے ہوں۔

پس امت کے اندر سے ایک جماعت کا استغفار بھی عذاب کو دفع کرتا رہتا ہے۔ اور جب تک یہ جماعت اعلان برأت کر کے علیحدہ نہ ہو جائے، اس کی برکت پوری قوم پر سایہ افکن رہتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مجادلہ کا جو واقعہ قرآن نے سنایا ہے اس سے اس دعویٰ کا ثبوت ملتا ہے بالکل یہی صورت حالات قریش کے معاملہ میں بھی تھی۔ قریش عذاب کے مستحق ہو چکے تھے لیکن پیغمبرؐ اور

مومنین کی موجودگی نیز بیت اللہ کی برکت اور مکہ کے متعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا مانع عذاب تھی۔ یہاں تک کہ مومنین مکہ سے ہجرت کر گئے اور پیغمبر کی امانت اٹھ گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس سرزمین مطہر کو سرکشوں اور نافرمانوں سے پاک کر دیا اور مومنین کے لئے ہجرت کے بعد "فرقان" کا جو وعدہ فرمایا تھا وہ پورا کیا اور یہ سب کچھ اس طرح ہوا کہ بیت اللہ کی حرمت کو کوئی بٹ نہیں لگا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کے متعلق جو دعا فرمائی تھی وہ ہر حال میں مستجاب رہی۔ اس معاملہ کے بعض پہلوؤں کی تفصیل تفسیر سورۃ اہل اور تفسیر سورۃ الکافرون میں ملے گی۔

ایک لطیف اشارہ

۸۔ ثمود کی سرکشی کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے اپنے پیغمبر کو صرف جھٹلانے پر نہیں کیا۔ ناکہ گو کاٹ ڈالنے کے بعد، انھوں نے پیغمبر کو قتل کرنے کا بھی ارادہ کیا۔

قَالُوا إِنَّمَا سَمِعْنَا ابْنَ اللَّهِ
لَنَنْبِتَنَّهُ وَأَهْلَهُ نَشْتُمُ
اَنْحُوْنَ لَہَا اَدَا پِسْ مِیْ خَدَا کِ
قَمِ کھاؤ کہ ہم ضرورت کے وقت صالح
اور اس کے گھروالوں پر چھاپا ماریں گے
لَنَقُوْلَنَّ لَوْ لَیْتَ مَا شَہَدْنَا

مَهْلِكَاتِ اٰهْلِهِمْ وَاِلَاصْدِرُوْا
 پھر ہم اس کے وارث کو کہہ دیں گے کہ
 وَمَكْرُوْا مَكْرًا وَمَكْرَنَا
 اسکے اہل کے مارے جانے کے وقت
 مَكْرًا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ
 تو ہم موجود ہی نہ تھے اور ہم بالکل سچے
 فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
 ہیں اور وہ ایک داؤ چلے اور ہم بھی
 مَكْرٍ حَسْبُنَا مَا نَمَكَّنَّا لَهُمْ
 ایک داؤ چلے اور ان کو کچھ خبر نہ تھی پس
 وَقَوَّعْنَاهُمْ اَجْمَعِيْنَ
 دیکھو ان کے داؤ کا انجام کیسا ہوا۔ ہم نے
 ان کو اور انکی قوم سب کو ہلاک کر مارا
 (ان)

اسی کے ساتھ دیکھو قریش نے اپنے پیغمبر کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ قرآن مجید میں ہے۔

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ
 اور یاد کرو جب کافر تم پر داؤ چلا رہا
 كَفَرُوْا بِالْبَيْتِ الَّذِيْ
 تھے کہ تم کو قید کر لیں یا قتل کر ڈالیں
 اَوْ يُخْرِجُوْكُمْ
 یا جلا وطن کر دیں اور وہ اپنا داؤ گار
 وَتَبٰىكَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرٌ
 تھے اور اللہ اپنی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ
 الْمَاكِرِيْنَ (الانفال)
 بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔

یہ دونوں واقعات کس قدر مشابہ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے، ایک ہی واقعہ
 دو طرح تبصیر کر دیا گیا ہے۔ صرف الفاظ کا فرق ہے۔ قریش کے معاملہ کی اٹھ

بالکل ثنود کے معاملہ کے انداز پر تھی اسلئے معلوم ہو گیا کہ ان کی سرکشی بالآخر کس نتیجہ تک
 منتہی ہوگی۔ پس اللہ تعالیٰ نے ثنود کے حالات کی ایک تصویر ان کے سامنے رکھ دی
 تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ جس طرح ثنود نے حضرت صالح کو قتل کر دینے کا ارادہ کر لیا
 تھا اسی طرح قریش بھی اپنے پیغمبر کو قتل کرنے کی سازشیں کریں گے اور جس طرح ثنود
 اپنی ان شرارتوں کی پاداش میں ہلاک ہوئے اسی طرح بالآخر قریش بھی پارہ پارہ
 کر دیئے جائیں گے۔ ثنود نے اونٹنی کو قتل کر کے چاہا کہ دیکھیں اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔
 ان کا خیال تھا کہ اگر صالح کی بات سچی ہے تو عذاب ضرور آئے گا اور اگر عذاب
 نہ آیا تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ سب صالح کی زبانی دہمکیاں ہیں اور پھر ہم اس کو
 بے درہنہ تیتھ کر دیں گے۔ لیکن خدا نے ان کو مہلت نہ دی، قبل اس کے کہ وہ اونٹنی
 کے قتل کے بعد پیغمبر کے قتل کا ارادہ کریں، عذاب الہی نے نمودار ہو کر ان کی ساری
 سازشیں درہم برہم کر دیں۔

پس یہ واقعات یہاں اس لئے سنایا گیا کہ قریش اپنے آغاز و انجام کی پوری تہمت
 پہلے سے سن رکھیں اور اگر اس سے عبرت حاصل کرنا چاہیں تو عبرت حاصل کریں
 اور قرآن نے، جیسا کہ اس کا طریقہ ہے واقعہ کی پوری تفصیل نہیں بیان کی ہے۔
 بلکہ جس طرح عبرت و عظمت کے واقعات وہ بیان کرتا ہے اسی طرح اسکی

بعض اہم خبریات کی طرف اشارہ کر دیے ہیں۔ هَلْ اَمَّاكَ حَدِيْثُ
الْجُنُوْدِ فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ بَلِ لِّدِيْنِ كُفْرُوْا فِیْ تِلْكَ اٰیٰتِ اللّٰهِ مِنْ
وَرَاكُهُمْ مَّحِيْطٌ۔

لیکن پڑھنے والوں کو انہی اشارات کی مدد سے ذہن میں پوری تصویر
تیار کر لینی چاہئے۔ اور جو لوگ اس طرح ثمود کے واقعہ پر غور کریں گے وہ بے شک
اس نتیجہ تک پہنچ جائیں گے جس نتیجہ تک ہم پہنچے ہیں یعنی اس میں قریش کے عوام
واعمال اور ان کے احوال و نتائج کی طرف نہایت لطیف ترغیبات ہیں۔

اس طرح کے اجمالی اشارات کسی واقعہ کے متعلق اس کے ظہور سے پہلے اس لئے
گردیے جاتے ہیں کہ جب وہ واقعہ ظہور میں آئے تو یہ عینی پیشینگوئیاں مومنین و
منکرین دونوں کے اندر اس امر کا یقین پیدا کریں کہ اللہ کے وعدے بالکل سچے
ہیں اور وہ ضرور پورے ہوں گے۔

قرآن مجید اور اگلے صحیفوں میں تنبیہات و بشارات کے سلسلہ میں اس
نکتہ کی طرف اشارات کر دیئے گئے ہیں۔

ایک شاہِ امتِ محمدیہ کے باب

۹۔ اگرچہ ہماری اس کتاب کا مقصد اشارات و لطائف کی جستجو نہیں ہے لیکن ایک ایسی بات کا ذکر تھا، اللہ ناموزوں نہ ہو گا جو سرکشی اور نفس کی مطلق انسانی کے انجام کو ہمارے سامنے کر دے کیونکہ یہ چیز اس درجہ اہم ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے امتِ محمدیہ کو کبھی ہلاک نہیں فرمایا لیکن اسی چیز کی بدولت وہ بارہا ہلاکت کے قریب پہنچ چکی ہے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں پھلی قوموں کے جو واقعات اور مثالیں بیان کی ہیں ان سے سبق حاصل کرنا اصلی علم ہے۔

انبیاء کے صحیفوں اور قرآن میں یہودی سب سے بڑی شہادت یہ بیان کی گئی ہے کہ انھوں نے انبیاء و صلحاء کو قتل کیا۔ سورہ بقرہ میں ہے۔

وَضَرَبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ	اور مار دی گئی ان پر ذلت اور مکت
وَأَمْسَكْنَهُمْ سِكَانًا يَخْضِبُونَ	اور وہ لوٹے اللہ کا غضب لیکر یہ اسوجہ
مِنَ اللَّهِ ذُلًا لِّمَا كَانُوا	کہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے او
كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ	نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ یہ اسوجہ
وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ	سے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور

الْحَقِّ ذَاتِ مَا عَصَوْا اور عدد سے بڑھ جاتے تھے۔

وَكَانُوا يُعْتَدُونَ

یعنی انھوں نے سرکشی اور عدد ان کی وجہ سے ابنیاء کو قتل کیا۔

سورہ بقرہ ہی میں دوسری جگہ ہے۔

أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ

بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنْفُسُكُمْ

أَسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيقًا

كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ

وَمَا لَكُمْ لَوْلَا قَوْلُ بَنِي آدَمَ

بَلْ لَعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ

فَقَدِيلًا مَّا يَوْمُنُونَ

یعنی ان کے کفر اور استکبار کی وجہ سے جس نے ان کو ابنیاء کی تکذیب اور قتل پر آمادہ کیا، اللہ تعالیٰ نے ان پر گراہی کی لعنت کر دی۔

یہی مضمون سورہ آل عمران میں وارد ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ

بِشَيْءٍ جَوَّارِكَ اللَّهُ فِي آيَاتِ كَانُوا

بِأَيِّ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ
 النَّبِيِّنَ بِغَيْرِ حَقٍّ قَدْ
 يَقْتُلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ
 بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ
 فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ
 أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ
 أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ
 الْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِنْ
 نَاصِرِينَ

کرتے ہیں اور انبیاء کو ناحق قتل
 کرتے ہیں اور ان کو قتل کرتے ہیں
 جو لوگوں میں سے عدل کا حکم دیتے
 ہیں تو ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری
 پہنچا دو وہی ہیں کہ جن کے اعمال
 دنیا و آخرت میں ڈھکے اور اٹکا
 کوئی مددگار نہیں ہے۔

اس آیت میں نہایت وضاحت کے ساتھ فرما دیا ہے کہ صلحا اور عدل
 قسط کا حکم دینے والوں کا قتل کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک
 یہ بہت بڑی بات ہے، چنانچہ اس کا ذکر انبیاء کے قتل کے ذکر کے بعد فرمایا۔ اسکی
 وجہ ظاہر ہے کہ اس محصیت کا محرک حقیقت وہ عصیان و عدوان ہے جو
 انبیاء کے قتل کا باعث ہوا اور جس کا ذکر اس باب کی اوپر والی آیت میں ہوا ہے۔
 اب ایک قدم آگے بڑھ کر ایک اور حقیقت پر غور کرنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ

کا قانون ہے کہ چند افراد و اشخاص کے کسی جرم کی پاداش میں اللہ تعالیٰ پوری قوم پر اپنا غضب نہیں نازل کرتا مگر اس وقت جبکہ ان کے ہاتھوں سے عدل و قسط کا کوئی بنیادی قانون ڈھیر ہا ہوا اور دوسرے خاموشی سے ان مجرمانہ اعمال کا تماشا دیکھیں اور مجرموں کا ہاتھ نہ پکڑیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عدل و قسط کا قیام اس پورے نظام کائنات کے بقا و قیام کے لئے ناگزیر ہے۔ پس ضروری ہے کہ جب اسکو کوئی صدمہ پہنچے تو سب اس کے لئے درد مند اور پھین ہوں اور اللہ تعالیٰ کے قانون کی حفاظت کے لئے جوش اور غضب بھر جائیں جو ایسا نہ کریں گے وہ حقیقت مجرموں کے شریک حال اور معاون تصور ہوں گے۔ اسی بنیاد پر قرآن نے ان لوگوں کو نہایت سخت الفاظ میں ملامت کی ہے جو جنگ و جہاد کے مواقع پر گھروں میں بیٹھے رہے اور حمایت حق و عدل کے جوش نے ان کو پھین نہیں کیا۔ قرآن مجہاں امت کو اللہ و رسول کی کامل اطاعت کا حکم دیا ہے وہاں اس امر کی تصریح کر دی ہے۔ سورہ انفال میں ہے :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا
اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ
إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ

اے ایمان والو! اللہ کا حکم مانو اور رسول
اور رسولوں میں وادعیان کیے
کیونکہ رسول اللہ کی اطاعت کی طرف تباہی جگہ

وَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَحُولُ
بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ وَأَنَّهُ
إِلَيْهِ تُخْشَرُونَ وَاتَّقُوا
فِتْنَةً لَا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ
ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً وَ
اعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ
الْعِقَابِ وَادْكُرُوا إِذْ أَنْتُمْ
قَلِيلٌ مُسْتَضْعَمُونَ فِي
الْأَرْضِ تَخَافُونَ أَنِ
يَخْلُقَكُمْ النَّاسُ فَأُولَئِكَ
وَأَيُّكُمْ مُنْصَرِفٌ
رَبِّ قَالُوا مِنَ الطَّيِّبِينَ
لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا
لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ

وہ تم کو بلاتا ہے ایسی چیز کیلئے جو تم کو زندگی
بخشنے کی اور یاد رکھو کہ اللہ آدمی اور اس کے
دل کے بیچ میں حائل ہو جاتا ہے یعنی
آدمی کے دل کے عہدیدوں کو قبل اسکے کہ
آدمی خود انکا احساس کرے اللہ تعالیٰ
جان لیتا ہے اور اسی کے پاس تم جمع کئے
جاؤ گے (پس جو کچھ تم نے چھپا رکھا ہے اور
جو کچھ ظاہر کیا ہے سب کا حساب ہو گا کیونکہ
وہ تمہارے ظاہر و باطن سے باخبر ہے) اور
اس فتنے سے بچو جو خاص انہی لوگوں کو
نہیں پہنچے گا جنہوں نے تم میں ظلم کیا ہے
(یعنی صرف وہی لوگ مآخوذ عذاب نہ ہونگے
جنہوں نے پیغمبر کی نافرمانی کی ہے کیونکہ کاتبہ
لوگوں پر یہ فرض تھا کہ وہ نافرمانوں کو
روکے اور پیغمبر کے ساتھ ہمدردی کرتے)

وَتَخُونُوا أَمْنَكُمْ وَآمْنَكُمْ اور یاد رکھو کہ اللہ سخت پاداش والا ہے

تَعْلَمُونَ اور یاد کرو جب تم زمین میں تھوڑے

..... اور کمزور تھے۔ ڈرتے تھے کہ لوگ تم کو ہلکے

..... یہ جانیں۔ پس اللہ نے تم کو نپاہ دی اور

..... اپنی مدد سے تمہاری تائید کی اور تم کو پاک

..... روزی دی تاکہ تم شکر ادا کرو۔ اے ایمان

..... والو! اللہ اور رسول سے جہنم نہ کرو اور

..... نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو اور تم جانتے ہو۔

ان آیات میں صاف بیان فرمادیا کہ اگر کسی قوم کے چند افراد کسی جماعتی

سعیت کا ارتکاب کریں اور باقی سب خاموش رہیں، ان کے

ہاتھ نہ پکڑیں، تو ان کے جرم کی پاداش میں پوری قوم مآخوذ ہوگی۔

کیونکہ انہوں نے حق وعدل کو، جو سب کی متاع مشترک تھا، تنہا چھوڑ

دیا۔ نمود کے واقعہ کی بالکل یہی نوعیت تھی اور یہی سبب ہے کہ ان

کے اندر سے ایک بد بخت نے جو کچھ کیا اس کے وبال میں پوری قوم

گرفتار ہوئی۔ چنانچہ دیکھو قرآن نے اس ایک شخص کے فعل کے لئے

”عقروہا“ کا لفظ استعمال کیا، یعنی جمع کا صیغہ اور انٹنی کے کاٹ ڈالنے کے جرم کو پورے قوم کی طرف منسوب کیا کیونکہ قوم نے اس جرم پر خاموشی اختیار کر کے درحقیقت اپنی پسند کی اور رضا کا اظہار کر دیا تھا۔

ہمارے نزدیک یہ بات عملاً بھی بالکل صحیح ہے کیونکہ گناہ درحقیقت قنب کی ایک صفت ہے، ظاہری اعمال و افعال تو محض اس کے آثار ہیں۔ پس اگر کوئی شخص کسی گناہ پر پیش ہے اور اس کو اچھا سمجھ رہا ہے تو یقیناً وہ اس شخص کے برابر ہے جس نے اس گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جابجا بہت سے اعمال و افعال یہود کی طرف ایسے منسوب کیے ہیں جن کی اصلی ذمہ داری ان کے آباء و اجداد پر عائد ہوتی تھی لیکن چونکہ اعلاف و غلبہ بھی ان افعال کو پسند کیا اس لئے جائز ہوا کہ وہ ان کی طرف منسوب کئے جائیں۔ باپوں کے جرم میں بیٹے جو پکڑے جاتے ہیں تو اس میں بھی یہی راز ہے اور اس ایک اور دقیق نکتہ بھی ہے جس کو ہم سورہ نوح کی تفسیر میں بیان کیا ہے اور وہ اس کے مہمات مطالب میں سے ہے۔

قوموں کے مواخذہ کا قانون

۱۰۔ کوئی قوم جب نافرمانی کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو فوراً تباہ نہیں کر دیتا

اس کے بہت سے گناہوں سے درگزر کرتا ہے، اور مہلت دیتا ہے تاکہ جو توبہ کرنا چاہیں وہ توبہ کر لیں اور جو ہلاک ہونا چاہیں وہ پورے طور پر عذاب کے سزا ہو جائیں۔

وَلَوْلَا اِخْدُ اللّٰهُ النَّاسَ
بِظُلْمٍ مِّنْ مَا تَرَوْهُ عَلٰى ظُهُرِهَا
مِنْ دَابَّةٍ وَلٰكِنْ يُّوحِخُّهُمْ
اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى

اور اللہ لوگوں سے ان کے ظلم پر فوراً
مواخذہ کرتا تو روئے زمین پر کسی جاندار
کو زندہ نہ چھوڑتا لیکن وہ ان کو مہلت
دیتا ہے ایک مدت متعینہ تک۔

چنانچہ یہود کو اللہ تعالیٰ نے ان کی نافرمانیوں پر بار بار سزا تو دی لیکن
جب تک حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنے نعم
کے مطابق انھوں نے قتل کر کے اپنا پیمانہ لبریز نہیں کر لیا، اس وقت تک اللہ تعالیٰ
نے نہ تو اپنی شریعت ان سے چھینی اور نہ ان سے اپنا رشتہ کاٹا۔ البتہ جب انھوں نے،
اپنے خیال کے مطابق، اس تیسرے خون کی ذمہ داری بھی اپنے سر لے لی تو وقت
آگیا کہ خدا کا عذاب ان کو تباہ کر دے۔ اس تمہید کے بعد دو اہم باتوں کا خاص
طور پر خیال رکھو۔

(۱) قرآن مجید سے معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ قوموں کے برے اعمال کے نتائج
فوراً نہیں ظاہر فرماتا بلکہ اس کی حکمت مقتضی ہوتی ہے کہ لوگوں کو مہلت دے

یہاں تک کہ وہ عذاب کے پوری طرح مستحق ہو جائیں۔

(۲) نویں فصل میں ہم نے بتایا ہے کہ انبیاء و صلحا اور عدل و قسط کی دعوت پر والدین کا قتل شدید ترین مہیت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس سے بڑھ کر کوئی جرم نہیں۔ اب ہم گزشتہ امتوں میں سے ایک امت اور اس امت مرحومہ کی تاریخ کے چند واقعات کی روشنی میں بھن ایسے نتائج و احوال کی طرف رہنمائی کریں گے جو ماضی میں واقع ہو چکے ہیں اور ضرور ہے کہ آئندہ بھی واقع ہوں۔ اور یہ تہذیب پر سنّت الہیہ کے ہے جس کی نسبت قرآن مجید میں وارد ہے کہ ولن تجد لسنة الله تبديلا تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔ اور اس سے مراد سرکشوں اور مفسدوں کی گرفت کا وہ قانون ہے جو اٹل ہے اور ہمیشہ بے لاگ ظہور میں آتا ہو، کبھی اس میں تحلف نہیں ہوتا۔

امت مرحومہ میں ناقہ اللہ کی مثال

۱۱۔ ثمود نے اللہ کی اونٹنی کو قتل کر کے سرکشی کی جو مثال مشوم قائم کی تھی یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کا ارادہ کر کے بعینہ اس مثال کی تقلید کی گویا یہود کے اندر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وجود گزینی ناقہ اللہ کی مثال تھا۔ یہ مثال محض ہماری طبع زاد

نہیں ہے۔ قرآنی اشارات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ ناقہ کے متعلق معلوم ہے کہ یہ ایک ہیئت اللہ تھی، بعینہ یہی بات قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق بھی ملتی ہے۔ سورہ انبیاء میں ان کی نسبت وارد ہے۔ وجعلناھا وابنھا الیة للعالمین اور ہم نے اس کو (مریم) اور اس کے بیٹے (حضرت عیسیٰ) کو دنیا والوں کے لئے نشانی بنایا۔ یعنی ان کا وجود خود ایک ہیئت تھا۔ چنانچہ اس جرم کی بادشاہ میں یہود و ثمود کی طرح پامال کر دیئے گئے اور نعمت نبوت ان سے چھین لی گئی۔

بعینہ اس کے مشابہ واقعہ امت مرحومہ میں پیش آیا۔ اس امت کے اندر ناقہ کی مثال حضرت علیؑ تھے، چنانچہ ان کے قتل کے بعد اس امت سے خلافت چھین لی گئی اور خلفاء کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ان کے بعد جو لوگ مسند خلافت پر متمکن ہوئے وہ خلفاء نہ تھے، بلوک و سلاطین تھے (الامام اشار اللہ) جو مال و جائیداد کی طرح بادشاہت کو وراثت میں پاتے تھے اور بادشاہوں کی طرح فرمانروائی کرتے تھے۔ آنحضرت صلعم نے اس انقلاب کی پیشنگوئی فرمادی تھی۔ اور اس دور کو "ملک مھنوف" کے لفظ سے تعبیر فرمایا تھا۔ بعض روایات میں ان تمام امور کی طرف اشارات ملتے ہیں۔ ایک مرتبہ آپؐ حضرت علیؑ سے فرمایا:-

”اے ابو تراب (علیؑ) کیا میں تمہیں بدبخت ترین خلیق اہل بنی نضیرؑ کی خبر نہ دوں
جس نے ناقہ کو قتل کیا اور جو تم کو اس پر (سر پر) مارے گا اور اس سے یہ (جڑ بھی)
تر ہو جائے گی“

۱۲۔ حضرت عمر عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کی کشالیں

تم کہو گے کہ حضرت علیؑ سے پہلے حضرت عثمانؓ نہایت مظلومیت اور
بیکسی کی حالت میں قتل ہوئے، جن کے بعد فتنوں کا دروازہ کھل گیا، حضرت
فاروق اعظمؓ شہید ہوئے، جن کی شہادت تاریخ اسلام کا سب سے بڑا حادثہ ہے۔
سب سے آخر میں حضرت امام حسینؓ قتل ہوئے، جن کی مظلومیت تاریخ میں
ہمیشہ یادگار رہے گی۔ پھر ہم نے ان میں سے کسی کے واقعہ کو حضرت عیسیٰؑ
کے واقعہ سے کیوں نہیں تشبیہ دی؟ اس کے لئے حضرت علیؑ ہی کے واقعہ
کو کیوں انتخاب کیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کی شہادت کا واقعہ ایک مخصوص
نوعیت رکھتا ہے۔ آپ کے قتل کی ذمہ داری اس امت پر نہیں ہے۔ آپ کو
ایک عیسائی نے شہید کیا۔ اسی لئے حضرت عمرؓ نے جب یہ سنا کہ آپ کا قاتل

ایک نصرانی ہے تو نہایت خوش ہوئے کہ امت آپ کے قتل کے وبال سے
 نکل گئی۔ حضرت تھوڑے سے اشارے اس جرم سے راضی تھے اور چونکہ پہلا خون
 نفا میں لائے قانون انبی کے اعمال سے کام لیا۔ پس حضرت عمرؓ حضرت زکریاؑ
 سے زیادہ اس شبہ نظر آئے ہیں جس طرح وہ قربان گاہ اور مسجد کے درمیان
 قتل ہوئے۔ اسی طرح حضرت عمرؓ بھی نماز کے اندر شہید ہوئے۔ اسی لئے
 حضرت کوئٹہ فرمایا کہ ”حضرت عمرؓ کا علیہ تورات میں موجود ہے“ اور اس میں
 شبہ نہیں کہ حضرت عمرؓ کی بہت سی صفیت تورات میں بیان ہوئی ہیں۔ آیت
 ”ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيلِ“ کی تفسیر کے ذیل
 میں بعض ضروری باتیں ملیں گی۔

حضرت عثمانؓ کی حالت حضرت یحییٰ علیہ السلام کی حالت سے زیادہ
 شبہ ہے۔ جس طرح حضرت یحییٰ علیہ السلام قید کی حالت میں قتل کئے گئے
 اسی طرح حضرت عثمانؓ مکان کے اندر بند کر کے شہید کئے گئے۔ پس حضرت
 عیسیٰ علیہ السلام کے موالدہ سے جو شبہ بہت حضرت عثمانؓ کے واقعہ کو ہے، وہ
 کسی دوسرے واقعہ کو نہیں ہے۔ نتائج کے اعتبار سے بھی دونوں بالکل یکساں
 درجہ کی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کا ارادہ

کر کے خدا کی امانت سے محروم ہو گئے۔ اور مسلمان حضرت علیؑ کے قتل کی ذمہ داری لے کر خلافت مقدسہ سے محروم ہو گئے۔

باقی رہا حضرت امام حسینؑ کی شہادت کا معاملہ، تو یہ تو ملت مرحومہ کے سینہ کا وہ زخم ہے، جو ہمیشہ تازہ رہے گا اور تاریخ کبھی اس کو فراموش نہ کر سکے گی۔ اور حقیقت اسی بد بختی کا ایک منظر ہے، جو حضرت علیؑ کے قتل کی صورت میں نمودار ہوئی تھی۔ ذہیر نے جنگ کے نتائج کو احمر عادی سے تشبیہ دینی ہے۔ اور کیا خوب بات کہی ہے :-

فتنہ تیج لکم عظام الشام کلہم کاہر عادی شمع توضع ففقطم
ایک برائی دس برائیوں کا دروازہ کھولتی ہے۔ پس حضرت علیؑ کے قتل کی صورت میں جو شقاوت ظاہر ہوئی اسی کی پرورش و رعناعت سے وہ حادثہ طور میں آیا، جو حضرت امام حسینؑ کی مظلومانہ شہادت کی شکل میں ظاہر ہوا اور پھر اس واقعہ کی بڑے سے اس طرح کے ہزار ہا فتنوں کی شاخیں پھوٹیں اور پھیلیں اور ان کے مسموم اور ہلک ٹرات نہ جانے کن کن صورتوں میں نمودار ہوئے۔ یہ مسلمانوں کے جان و مال کی اباحت کے جو ہولناک اور نثرناک واقعات بار بار پیش آئے، یہ سب اسی شجرہ ملعونہ فساد کے برگ بار

اور یہی فتنے تھے جن سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ الوداع میں آگاہ فرمایا تھا۔

یا ایھا الناس انھا المومنون	لوگو تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی
اخوة ولا یحل لامر عیال	ہیں کسی شخص کیلئے یہ بات جائز نہ ہوگی
اخذیة الا عن طیب نفس	کہ وہ اپنے بھائی کا مال لے لے مگر اسکی
سواء الا اهل بلعت الهم	اجازت اور خوشی سے۔ آگاہ میں خدا کا
اشهد ان لا یجوز	پیغام پہنچا دیا۔ اے اللہ تو گواہ رہ۔ پس
بعادی کفار۔ یضرب	اے لوگو نہ ہو کہ تم میری بعد حالت کفر
بعضکم رقاب بعض	میں لوٹ جاؤ تم میں سے ایک دوسرے
.....	کی گردن مارنے لگے۔

قرآن مجید نے بھی باہمی جنگ و جدل کو عذاب الہی سے تعمیر فرمایا ہے۔

سورہ انفام میں ہے۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ اَنْ	کہہ دو کہ وہ قادر ہے اس بات پر کہ تم پر
يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ	عذاب بھیجے تمہارے اوپر سے یا تمہارے
فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اُطْرُقِكُمْ	قدموں کے نیچے سے یا تم کو گروہ درگروہ
اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيْعًا وَيُذِيقَ	کر کے تم کو باہم مکرادے اور ایک کو

بَعْضُكُمْ بِأَنسَ بَعْضٍ أَنْظُرْ دوسرے کا عذاب کچھائے دیکھو ہم اپنی
 كَيْفَ نَصَرَفُ الْآيَاتِ آیتیں کس طرح پھر پھر کر بیان کرتے
 لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ ہیں تاکہ وہ سمجھیں۔

چنانچہ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد یہ عذاب نمودار ہو گیا۔ امت
 مختلف گروہوں میں بٹ گئی۔ اور حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی جماعتوں
 میں ایسی خونریز جنگیں ہوئیں کہ مسلمان بالکل بے دم ہو کے رہ گئے اور جیسا کہ
 قرآن مجید میں وارد ہے، اللہ تعالیٰ نے ایک جماعت کا عذاب دوسری جماعت
 کو کچھ دیا اور یہ آگ برابر شعل رہی۔ بلکہ یہ کہنا بالکل صحیح ہو گا کہ اس کے بعد مسلمانوں
 پر جتنی آفتیں نازل ہوئیں وہ تامترا نہی دونوں گروہوں یا اسی قبیل کی جماعتوں
 کے ہاتھوں نازل ہوئیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ گروہ بندی اور تفریق
 اس درجہ مبغوض تھی کہ اس نے اپنے پیغمبر کو اس سے بالکل بری قرار دیا تھا۔
 چنانچہ فرمایا: "ان الذين فرقوا دينهم وكانوا شيعا ولست منهم في شيء۔"
 جنہوں نے اپنے دین میں تفرق پیدا کر دیا۔ اور گروہ گروہ بن گئے۔ تم کو ان سے
 کوئی علاقہ نہیں۔ اسی طرح ایک اور موقع پر بھی باہمی جنگ و جدل کو عذاب
 تعبیر فرمایا ہے۔ "ومن الذين قالوا انا انصارى اخذنا ميثاقهم ففسوا

حفظاً مما ذكر وابه فاغرينا بينهم العداوة والبغضاء الى يوم القيمة
اور ان لوگوں میں سے جنہوں نے کہا کہ ہم نصاریٰ ہیں ہم نے ان سے بھی
بیوقوفی پیدا کر لی۔ وہ بھول گئے ایک حصہ اس چیز کا جس کے ذریعہ ان لوگوں
کو تذکرہ کی گئی تھی۔ (یعنی کتاب لہی) پس ہم نے بھڑکا دی ان کے درمیان عداوت
اور بغض کی آگ قیامت تک کے لئے۔

اس بحث کی اصلی جگہ سورہ حجرات ہے، اس لئے یہاں ان اشارات
پر ہم کفایت کرتے ہیں۔

سورہ کے ربط پر دوبارہ نظر

اس سورہ میں بدبختی اور شقاوت کے انجام کی تفصیل کی ہے۔ گویا پوری
سورہ ”وقد خاب من دساها“ کے اجمال کی تشریح ہے۔ اور ”قد افلح“
سے لے کر ”جہنم“ کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اس کا ذکر اس سورہ میں
معمول چھوڑ دیا ہے۔ اس کی توضیح نہیں فرمائی۔ اس کی توضیح بعد کی سورہ (سورہ
انہل) میں کی ہے۔

اس سورہ سے ربط کا پہلو یہ ہے کہ اس میں بتایا تھا کہ بیت اللہ کے

چند مقاصد ہیں۔ ایمان، صبر، حمت اور توحیدِ حق و صبر جو لوگ ان چیزوں کو اختیار کریں گے ان کے لئے کامیابی اور نصرت کی نعمتیں ہوں گی اور وہ صحابہؓ میں ہوں گے۔ اور جو ان سے اعراض کریں گے ان کے لئے برنجی اور شقاوت کی نصبتیں ہوں گی اور وہ اصحابِ شتمہ میں ہوں گے۔ پس اس سورہ میں قریش کے لئے اس برنجی اور شقاوت کی ایک مثال بیان کی ۱۰ اور اس کیلئے قوم ثمود کے واقعہ کو بطور مثال کے اختیار فرمایا۔ اس پہلو سے یہ سورہ سابق و لاحق دونوں سے مربوط ہو جاتی ہے اور اس کا موقع وہی ہے جو سورہ ماعون کا ہے، جیسا کہ اس کی تفسیر سے واضح ہوگا۔

لیکن اگر ان تمام سابق و لاحق تعلقات سے قطع نظر کر لیا جائے تو بھی یہ سورہ اپنے اندر ایک مستقل حکمت رکھتی ہے۔ یعنی اس میں سرکشی اور تکذیب کے نتائج پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دئے گئے ہیں۔ پس اگر تم اپنی نظر کو اسی سورہ کے مطالب تک محدود رکھو اور اس کے پیش و عقبہ تک نہ بھیل سکو جب بھی اس کی تعلیمات کم از کم سرکشی اور تکذیب کے باوجود اکٹھا پھینکنے کے لئے تو بالکل کافی ہیں۔ ہاں اگر اس کو سابق و لاحق سے مناکر دیکھو گے تو تم پر بعض نئی حقیقتوں کا انکشاف ہوگا۔ تم کو اس بیماری کی جڑ اور

اس بحث کی اصل بنیاد کا سراغ لگ جائے گا یعنی یہ معلوم ہو جائے گا کہ ان تمام مفاسد کی اصل حقیقت قساوت قلب ہے۔ اس کے متعلق ہم نے سبق سورہ کی تفسیر میں مفصل بحث کی ہے۔ وہاں ہم نے دکھایا ہے کہ جہالت، بجا اور سرکشی وغیرہ، تمام برائیوں کا اصل حشرہ قساوت قلب ہی ہے

۱۴۔ ولایحاف عقبہا کی تفسیر

قرآن مجید، جس طرح اگلے صحیفوں کا مصدر راوتم ہے۔ اسی طرح وہ ان کے اختلافات کے باب میں حکم اور ہمن ہے۔ اپنی رعیت قرآن مجید نے خود نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کر دی ہے۔ ایک جگہ توراۃ اور انجیل کے بیان کے بعد قرآن کا ذکر ان نقطوں میں آتا ہے۔

وَاَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ	اور ہم نے اتاری تم پر کتاب حق کے ساتھ
مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ	تصدیق کرتی ہوئی اس چیز کی جو اس کے
مِنَ الْكِتَابِ وَمُهِمِّنَا عَلَيْهِ	آگے (پہلے) ہے کتاب میں سے (یعنی
فَاَحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنْزَلَ	قدیم صحیفے) اور اگر اس ہے اس پر پس
اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ	فیصلہ کرو ان کے درمیان اس چیز کے

عَمَّاجَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ مطابق جو اشر نے اتاری ہے اور
 پیروی کرو ان کی خواہشوں کی پیروی کی
 تحریفات کی چھوڑ کر اس جی کو بوجھا ہے

دوسرے تمام پر ہے۔

إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ يَفْضُلُ عَلَى بے شک یہ قرآن بنی اسرائیل پر بیان
 بَنِي إِسْرَءِيلَ أَكْثَرَ الَّذِي کرتا ہے بڑا حصہ ان باتوں کا جنہیں
 هُمْ فِيهِ مُخْتَلِفُونَ وہ مختلف ہیں۔

قرآن مجید اپنے اس منصب کے لحاظ سے، جہاں اگلے صحیفوں کی بہت سی
 باتوں کی تصدیق کرتا ہے، وہیں ان کی بہت سی ایسی باتوں کی، جو یہود نے ان
 میں ملا دی ہیں، اور جن کو حقیقت سے کوئی علاقہ نہیں ہے، نہایت ہی زور و قوت
 کے ساتھ تردید بھی کرتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے: "وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ
 وَالْأَنْعَامَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتْمَةٍ إِيَّاهُمْ" اور ہم نے پیدا کیا آسمان اور زمین
 کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے پہلے دونوں میں (یہاں تک تو بعیدہ توڑا) کے بیان
 کی تصدیق تھی۔ پھر اس کے بعد فرمایا "وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُغُوبٍ" اور ہم کو ذرا بھی
 تھکان نہیں محسوس ہوئی (یہ ٹکڑا قرآن مجید کے ہمین اور حکم ہونے کی حیثیت کو

نمایاں کر رہا ہے۔ یعنی اس میں توراۃ باب پیدائش کے اس بیان کی تردید ہے جو یہود نے ملایا ہے کہ خداوند نے چھ دن کام کیا اور ساتویں دن آرام کیا۔

اس اسلوب کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں۔ قرآن مجید کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی باتیں کہتا چلا جاتا ہے اور انہی کے پیٹ میں کوئی ایسی بات کہتا ہے جس سے کسی خاص خیال کی تردید یا کسی مخصوص غلط فہمی کی اصلاح مقصود ہوتی ہے۔ اس تمہید کو ذہن نشین کر لینے کے بعد، زیر بحث مقام پر غور کرو۔

اللہ تعالیٰ کے متعلق جہاں بہت سی غلط فہمیاں لوگوں میں پھیلی ہوئی ہیں وہاں ایک غلط فہمی یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ان بہت سے کاموں پر، جو رحمت و نعمت کے اس سے صادر ہوتے ہیں، کبھی کبھی پھپھٹا یا بھی کرتا ہے چنانچہ اسکی ایک دھچپ مثال یہود کی عنایت سے توراۃ کی کتاب پیدائش میں بھی ہے۔

”اور خداوند نے دیکھا کہ زمین پر انسان کی بدی بہت بڑھ گئی ہے اھ

اس کے دل کے قصید اور خیال سدایرے ہی ہوتے ہیں، تب خداوند

زمین پر انسان کو پیدا کرنے سے طول ہوا اور دل میں غم کیا۔“

اسی طرح طوفان کے ذکر کے بعد ہے۔

”اور خداوند نے اپنے دل میں کہا کہ انسان کچھ سبکے میں بھر کبھی زمین

پرعت نہیں بھجوں گا کیونکہ انسان کے دل کا خیال لڑکپن سے برا ہے

اور نہ پھر سب جانداروں کو عیاں کیا ہے ماردوں کو۔“

قرآن کی تعلیم اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ کتاب ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ کرتا ہے، حکمت و رحمت کے ساتھ کرتا ہے۔ اگر وہ کسی قوم کی ہلاکت کرتا ہو یا کسی قوم کو رفعت و ترقی بخشتا ہے تو ایسا بنیہر کسی ضابطہ اور اصول کے نہیں کرتا اپنے اس قانون حکمت و رحمت کے مطابق کرتا ہے جو اس نے اپنے تمام کاموں کے لئے ازل سے ٹھہرایا ہے۔ پس اس کے کسی کام میں نہ خوف و طمع کا شائبہ ہے اور نہ کمی اور بیشی کا اندیشہ۔ اور اس لئے وہ مدامت و شرمندگی اور رنج و پچھتاوے کے تمام احوال و عوارض سے بالکل منزہ اور ارفع ہے۔ یہی حقیقت ہے جو یہاں ”ولا یخاف عقبہا“ سے واضح ہو رہی ہے اور اس طرح کتنی حقیقتیں ہیں، جو قرآن کی برکت سے، اللہ تعالیٰ نے ہم پر روشن فرمادی ہیں۔ حالانکہ دوسرے قرآن مجید کی روشنی سے محروم ہونے کی وجہ سے ان سے دور ہیں۔ فالحمد للہ تعالیٰ علی ما ھدانا لئی الصراط المستقیم واعطانا من الذکر الحکیم۔

سلسلہ دائرہ جمیدیہ نمبر ۱۳

تفسیر سورۃ النور

تالیف

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی اللہ علیہ رحمۃ

ترجمہ

امین احسن صلاحی

باہتمام عبدالاصد صلاحی

اصلاح پریس سرائے عظیم گڑھی چک

قیمت ۶

مکتبہ القرآن
میرپور

فہرست مضامین

نمبر شمار

صفحہ

- ۱- سورہ کا عبود، موقع اور ماقبل سے تعلق ۲
- ۲- انبیاء کا غنی عظیم، ان کی عظمت اور ان کے مواقع خطاب ۳
- ۳- الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی تاویل ۱۰
- ۴- ان آیات کا موقع نزول اور واقعہ کی اعلیٰ تصویر ۱۳
- ۵- ایک غلط فہمی کا ازالہ ۲۴
- ۶- پہلی غلطی سے بڑی غلطی ۳۰
- ۷- ان آیات کا ربط آگے سے ۳۳
- ۸- الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی تاویل ۳۵
- ۹- ان آیات کا باہمی نظم اور پیش و عقبہ تعلق ۴۵
- ۱۰- الفاظ کی تفسیر اور جملوں کی تاویل ۴۹
- ۱۱- اشیاء مذکورہ میں باہمی ترتیب و مناسبت ۵۵
- ۱۲- آیات کا تعلق آگے اور پیچھے سے ۶۰
- ۱۳- الفاظ اور جملوں کی تاویل ۶۴
- ۱۴- ایک لطیف نکتہ ۶۷
- ۱۵- پوری سورہ کے نظم پر ایک اجمالی نظر ۶۹

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

عَبَسَ وَتَوَلَّى (۱) اِنْ جَاءَهُ اِلَّا غُطُ (۲) وَمَا يُدْرِيكَ
لَعَلَّاهُ يَنْزِكُ (۳) اَوْ يَدَّكُرُفَدَنَّغَةُ الذِّكْرِ (۴) اَمَّا مَنِ
اسْتَنَعَزَ (۵) فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدَّقُ (۶) وَمَا عَلَيْكَ اَلَا يَنْزِكُ
وَاَمَّا مَنِ جَاءَكَ يَسْعُ (۷) وَهُوَ يَخْشَى (۸) فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهَّى (۹)

اسنی تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا (۱) اس پر کہ ایک اندھا اس کے
پاس آیا (۲) اور تجھے کیا معلوم، شاید وہ سدھرنا چاہتا ہو (۳) یا دہیان کرنا
چاہتا ہو تو اسے یاد دلانا مفید ہوتا (۴) جو بے پروائی کرتا ہے (۵) اس کے تو،
تو کچھ بڑا ہے (۶) حالانکہ تجھ پر کچھ الزام نہیں اگر وہ پاکیزہ بنا نہیں چاہتا (۷)
اور جو تیرے پاس دوڑ کر آتا ہے (۸) ڈرتا ہوا (۹) اس سے تو تغافل کرتا ہے (۱۰)

۱۔ سووہ کا موقع اور قابل تسلیم

یہ سورہ منذرات میں سے ہے یعنی ان سورتوں میں سے جو قوم کیلئے تہدید و وعید کی سرزنش لیکر نازل ہوئی ہیں۔ ابتدائے بعثت کی اکثر سورتوں کا یہی حال ہے۔ البتہ ان کے اسلوب بیان مختلف ہو گئے ہیں مثلاً اسی سورہ میں انداز کا ایک نیا پہلو اختیار کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان لوگوں کے پیچھے وقت ضائع کرنے سے روکا گیا ہے جو انکار اور نافرمانی پر اڑے ہوئے ہیں اور کسی طرح اپنی جگہ چھوڑنا نہیں چاہتے۔ پھر اسی مضمون سے متعلق آگے چلکر کچھ اور باتیں آگئی ہیں مثلاً چند لفظوں میں ان کی ہٹ دھرمی پر زبرد تو بیخ ہے، پھر ان کی ضد اور بے پروائی کی خرابیاں بیان ہوئی ہیں، پھر ان کے انجام کی تفصیل ہے اور آخر میں، مقابلہ کے اسلوب پر ان لوگوں کا بھی ذکر آ گیا ہے جنہوں نے، ان سے الگ ہو کر ایمان و اطاعت کی راہ اختیار کر لی ہے۔ اس اسلوب کے چند فوائد قابل ذکر ہیں۔ مثلاً

(۱) توضیح مطالب کے لئے مخالف پہلو کا ذکر مفید ہوتا ہے۔ و بصددھا

تنبین الاشیاء۔

(۲) اس میں تربیکے ساتھ ترغیب کا پہلو بھی پیدا ہو گیا ہے جو ایک جامع اور موثر انداز کلام ہے۔

(۳) اس میں آنحضرت صلیع کو اشارہ ہے کہ آپ کی توجہ کے صلی مستحق مومنین ہیں۔ ان کا حق مقدم ہے۔

سابق سورہ سے اس کا ربط یوں ہے کہ اس کے خاتمہ کی آیت ”اٰمّا انت منذر من یخشاہا“ تھی۔ یعنی تمہاری نصیحتوں کو وہی قبول کر سکتے ہیں جو قیامت سے ڈرتے ہیں۔ پس اس سورہ میں یہ بتا دیا کہ پیغمبر ایسے لوگوں سے اصرار و بجاہت پر مامور نہیں ہے جو قیامت کے خوف سے بے پروا ہو گئے ہیں۔ یہ مضمون قرآن مجید میں بار بار دہرایا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلیع غایت رافت و شفقت کے سبب یا فطری جوش تبلیغ و دعوت میں کبھی کبھی اصرار و الجاح کی راہ اختیار کر لیتے تھے۔ یہاں بھی وہی مضمون ہے، اور قرآن مجید نے تعلیم کو موثر اور دلنشین بنانے کیلئے، نابینا کے مناسب حال واقعہ کو بطور مثال اختیار کر لیا ہے اور پیغمبر صلیع کو تبلیغ و دعوت میں اصرار کی اس حد سے روکا ہے جو آپ کے

منصب کے شایان شان نہیں ہے۔ اور گو کلام کا ظاہر اسلوب تہنہ و عتاب کا ہے لیکن درحقیقت ان تمام مواقع میں، جہاں آنحضرت صلعم کو منکرین سے اعراض کا حکم دیا جاتا ہے، غصہ و عتاب کا اصلی رخ پیغمبر صلعم کے بجائے منکرین کی طرف ہوتا ہے۔ اور یہ تمام دعوت کا ایک نہایت معروف پہلو ہے جس سے اہل نظر ناواقف نہیں ہیں۔

سورہ کی یہ تاویل جو بالاجمال اور پر بیان ہوئی بالکل واضح ہے اور کسی صاحب بصیرت کو اس کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہو سکتی لیکن بعض مفسرین سے اس کی تاویل میں لغزش ہو گئی ہے جس کو ہم آگے بیان کریں گے لیکن اس سے پہلے ضروری ہے کہ ہم ایک فصل میں انبیاء کے خلق عظیم پر روشنی ڈالیں اور یہ واضح کر دیں کہ کبھی کبھی جو ان کو بانداز عتاب مخاطب کیا جاتا ہے، تو اس عتاب کا اصلی پہلو کیا ہوتا ہے۔

انبیاء کا خلق عظیم انکی عصمت اور ان کے مواقع عتاب

(۲) عقل و نقل کے تمام پہلوؤں سے یہ بحث طے پا چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ فرض رسالت کی ادائیگی کے لئے انہی لوگوں کو چنا جو اس کی

مخلوق میں اخلاق و تقویٰ کے نقطہ کمال پر تھے۔ چنانچہ فرمایا ہے ”وَاللّٰهُ يَعْلَمُ
 حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ اور اللہ خوب جانتا ہے کہ اپنی رسالت کا بوجھ کن پر ڈالے
 اور حضرت سرور کائنات کی نسبت فرمایا کہ ”وَاللّٰهُ يَعْلَمُ خَلْقَ عَظِيمٍ“ بیشک تم ایک خالق عظیم پر ہو۔
 اس مضمون کی توضیح صحیحین کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے جس کا
 مفہوم یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا اور بقیہ تمام
 مخلوق کو دوسرے پلڑے میں، جب آپ تمام مخلوق پر بھاری ثابت ہو
 تب آپ کا انتخاب فرض رسالت کی ذمہ داریوں کیلئے عمل میں آیا۔
 اس برگزیدگی کے بعد اللہ تعالیٰ ان کی تربیت فرماتا ہے، ان کو
 اپنے امر و نہی سے مطلع فرماتا ہے، اور جن چیزوں سے وہ ناواقف ہوتے
 ہیں ان کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ ہر لمحہ اس کے اشاروں پر چلتے، اور اس کی
 نگاہوں میں رہتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے۔ ”فَاللّٰهُ بَاعِنُنَا“ بیشک تو ہمارا
 نگاہوں میں ہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا ہے۔

فَاِنَّهُ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ	پس وہ ان کے اگے اور پیچھے پہرہ رکھتا
بَدَايِهِ وَمِنْ خَلْفِهِ	ہے تاکہ وہ دیکھ لے کہ انھوں نے بچنے
رَصَدًا لِّيَعْلَمَ اِنْ قَدْ	رکے پیغام پہنچا دیئے اور ان کے

أَلْبَغُوا مَسَکَاتِ سَیِّئِهِمْ سارے معاملات اس کے
وَأَحَاطَ بِمَا لَدَیْهِمْ وَ احاطہ میں ہیں اور اس نے
أَخْصَىٰ كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ہر چیز کو شمار کر رکھا ہے۔

یعنی عالم غیب کی ایک مخصوص نگاہ انبیاء کرام کی نگرانی کرتی ہے
ان کو لغزش سے بچاتی ہے۔ قبل اس کے کہ وہ کسی غلط راہ میں قدم رکھیں۔
خدا کا ہاتھ ان کی رہنمائی کیلئے نمودار ہو جاتا ہے اور کبھی وہ کسی پر خطر راہ میں
نکل جاتے ہیں تو صرف اتنی دیر تک کیلئے ان کو وہاں چھوڑا جاتا ہے
کہ وہ اپنے فرض نبوت اور منصب دعوت و تبلیغ کی ذمہ داریوں کو
ادا کر لیں، اس سے زیادہ ان کو وہاں ٹھہرنے کی اجازت نہیں دی جاتی
اور یہ بھی اس لئے کہ ایسا ہوتا سنت الہیہ اور قانون حکمت کا اقتضا ہے۔
اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے آزمائش کا قانون رکھا ہے۔ اور یہی
قانون ان کے باطن کی مخفی صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے۔

پس جب کبھی اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے کہ اس کے رسول کے قدم
کسی ایسی جگہ پہنچ گئے ہیں جہاں لغزش کا اندیشہ ہے، وہ فوراً اسکو
متنبہ کر دیتا ہے، اور اگر وہ پورے جوش و انہماک میں آگے بڑھتا چلا جاتا

تو بعض اوقات نہایت کھلے لفظوں میں بلکہ باند از عتاب روکا جاتا ہے۔ تاکہ جس چیز سے منع کیا جا رہا ہے اس کی اصلی اہمیت اس کے سامنے واضح ہو جائے۔ پیغمبر اس وقت چونک جاتا ہے اور سامنے کے خطرہ کو دیکھ کر خیال کرتا ہے کہ اگر خدا کے غیر مرئی ہاتھ نے نمودار ہو کر رہنمائی نہ کر دی ہوتی تو وہ تو بالکل منزلہ قدم کے قریب پہنچ چکا تھا! یہ چیز اس کے شکرو و انابت کے جذبہ میں ایک جوش پیدا کرتی ہے اور وہ تذل و تهنوع کی تمام نیاز مند یوں کے ساتھ اپنے پروردگار کے سامنے گر پڑتا ہے اور اس سے قریب تر ہو جاتا ہے۔ بالکل اس طرح جس طرح بچہ ماں کے ڈرا دینے کے بعد اس کے سینے سے اوپر چمٹ جاتا ہے۔

الغرض پیغمبر کا رجحان ہر حالت میں بھلائی ہی کی طرف ہوتا ہے۔ اس کا دل ہوا و ہوس کی آلودگیوں سے بالکل پاک ہوتا ہے۔ اس کا ہر قدم مرضات الہی کی راہ میں اٹھتا ہے۔ البتہ اسی میں کبھی کبھی فراط کی حالت اختیار کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو حق و اعتدال کی نیچ راہ پر لا کر کھڑا کر دیتا ہے۔ کیونکہ پیغمبر اپنی قوم کیلئے نمونہ ہوتا ہے۔ اسکی ہر چھوٹی بڑی بات پیروی و اقتداء کیلئے ہوتی ہے۔ پس اسکے کسی فعل میں اگر فراط کا ادنیٰ شائبہ بھی پایا گیا تو اس سے تمام امت کی راہ کج ہو جائیگی۔

اس افراط کا سبب یہ ہے کہ وہ انسانوں کے باطن سے بے خبر ہوتا ہے۔
 باطن کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ اس لیے بغیر کبھی کسی شخص کی اصلاح سے
 مایوس نہیں ہوتا کوئی شخص انکار و سرکشی کی کتنی ہی سخت و شدید حالت
 اختیار کرے لیکن وہ ایک ننگسار دوست اور ایک ہمدرد طبیب کی
 طرح لگا رہتا ہے۔ اور جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ظاہر نہ کر دیا
 جائے کہ فلاں شخص اللہ کا دشمن ہے، ایمان نہ لائے گا وہ اسکے ایمان و ہدایت
 سے مایوس نہیں ہوتا۔ البتہ حبیب اللہ تعالیٰ اعلان کر دیتا ہے کہ فلاں
 شخص اللہ کا دشمن ہے، اس پر ایمان و ہدایت کی راہ باز نہ ہوگی۔ اس سے
 علیحدگی اختیار کر لو، تو اس سے برأت کا اعلان کر دیتا ہے۔ اس معاملہ میں
 حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اسوہ قرآن مجید نے متعدد مقامات میں بیان
 کیا ہے۔

فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ پس جب اس پر یہ بات کھل گئی

لِلَّهِ تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ کہ وہ اللہ کا دشمن ہے وہ اس سے

لَا وَآلَهُ حَالِمٌ علیحدہ ہو گیا۔ بیشک ابراہیم بہت

..... ہی دردمند اور پردہ دار تھا۔

کبھی کبھی اس کے برعکس حالت بھی پیش آتی ہے یعنی پیغمبر کسی جماعت کی سرکشی اور اس کے تہذیب کو دیکھ کر اس کے ایمان و ہدایت کی طرف سے بالکل مایوس ہو جاتا ہے۔ حالانکہ وہ جماعت ابھی اس حد کو نہیں پہنچی ہوتی کہ اس سے مایوسی کا اعلان کر دیا جائے۔ اس کے جینے اور پنپنے کی ایک ہلکی سی آس باقی ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں اس کی مثال حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ ہے۔ اس طرح کے واقعات پیش آنے کی وجہ یہی ہے کہ پیغمبر دلوں کے حال سے ناواقف ہوتا ہے۔ وہ ظاہر کو دیکھ کر ایک فیصلہ کرتا ہے۔ حالانکہ اس طرح کے معاملات میں فیصلہ کا انحصار باطن کی حالت پر ہے۔ پس اس معاملہ میں صرف علام الغیوب ہی کا فیصلہ فیصلہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ بسا اوقات وہ کسی جماعت سے اعراض کا حکم دیتا ہے کیونکہ اس نے دیکھ لیا کہ اب یہ جماعت ایمان نہیں لانے کی اور بعض اوقات پیغمبر کو کسی مخصوص جماعت کے ساتھ صبر و ثبات اور مجاہدہ و ریاضت کا حکم دیتا ہے کیونکہ ابھی اس کے اندر صلاحیت کی گرمی موجود ہوتی ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ پیغمبر کی باگ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہ کبھی اس کو آگے بڑھاتا ہے کبھی روک لیتا ہے۔ اور یہ دونوں باتیں کسی خاص

اصول حکمت پر مبنی ہوتی ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ خدا کی نعمت ایسے لوگوں پر پیش کرتا ہے جو کسی طرح اس کے مستحق نہیں ہوتے، ایسے مواقع پر اس کی اعراض کا حکم دیا جاتا ہے اور اس کو مفطر جوش و دعوت پر پُر محبت عتاب ہوتا ہے۔ اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ کسی قوم کی سرکشی و نافرمانی سے اس کو غیرت حق لائق ہوتی ہے اور وہ ان سے بیزار ہو کر علیحدہ ہو جانا چاہتا ہے ایسے مواقع پر اس کو پُر عتاب حکم ہوتا ہے کہ ان کے اندر تبلیغ و دعوت کا جہاد جاری رکھے اور جب تک حکم خداوندی نہ ہو وہ حق کو کتنی ہی بید روی کے ساتھ ٹھکرائیں لیکن وہ صبر و ضبط کو ہاتھ سے نہ دے۔ غرض کبھی اس کے کمال رحمت و شفقت پر عتاب ہوتا ہے اور کبھی کمال غیرت حق پر۔ اور یہ دونوں حالتیں ایسی ہیں جو نفس کی الایشوں سے پاک ہیں۔

۳۔ اِلْفَاظِ کی تحقیق اور جملوں کی تاویل

[عبس] منہ بنایا، تیوری چڑھائی، ترشرو ہوا۔ اس کی مزید تشریح توئی نے کردی۔ توئی یعنی اعراض کیا۔

[اَن جَاءَكَ] اصل میں ”اَن جَاءَكَ“ ہے۔ یہ ترشرو ہونے کا سبب بیان ہوا کہ دراصل ترشروئی کا باعث اس وقت نابینا کا آنا تھا، نہ کہ انکی ذات۔

مزید تفصیل آگے آتی ہے۔

[الاعلم] نابینا۔ اس بات پر سب متفق ہیں کہ یہاں مراد ابن ام کثومؓ ہیں۔ ان کا نام بھی لیا جاسکتا تھا۔ لیکن اس صفت کے ساتھ ذکر کرنے سے ایک طرف تو ان کے ضعف و احتیاج کی حالت ظاہر ہو گئی دوسری طرف یہ معلوم ہوا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس وقت کی مشغولیت سے بالکل لاعلم تھے پس مقتضائے حال کی بے شمار بلاغیتیں اس لفظ کے اندر پنہاں ہیں۔

[وما یدریاک لعلہ یزکی] ما یدریاک کا مفعول یہاں محذوف ہے۔ اس کا قائم مقام لعلہ یزکی ہے۔ یہ حسب قاعدہ مقابلہ مفعول محذوف کا مؤثر پتہ دے رہا ہے۔ ایک جگہ فرمایا ہے ”وما یدریاک لعل الساعۃ قریب یعنی تمہیں کیا خبر کہ قیامت بہت دور ہو شاید وہ قریب آگئی ہو۔ دیکھو لعل الساعۃ قریب کے ٹکڑے نے اہل مفعول کی طرف خود انگلی اٹھا دی کیونکہ جملہ کی نوعیت مقتضی ہے کہ اس کا ایک مقابل بیان محذوف مانا جائے۔ پس آیت کی تاویل یہ ہوگی کہ تمہیں کیا معلوم کہ اس کا آنا سہارا اور دھیان کیلئے نہیں ہے کہ تم کفار کے طعنہ کی شرم میں پڑ گئے کہ وہ کہیں گے ”محمدؐ کے پیروانہ سے اور عاجز لوگ ہیں۔ جو بیوقوفی اور طمع کی وجہ سے ان کی باتوں میں آگے ہیں پس ہم انکی

پیروی کر کے ایسوں کی رفاقت کا ننگ کیسے گوارا کر سکتے ہیں۔“

اس سے صاف واضح ہے کہ آنحضرت صلعم کو بالکل نہیں معلوم تھا کہ ابن ام مکتوم اس وقت تعلیم و تزکیہ کا کوئی مقصد لے کر آئے ہیں۔ آپ کو جو چیز ناگوار ہوئی وہ محض ان کا اس وقت کا آنا تھا اور اس کا باعث وہی خیال تھا جو اوپر بیان ہوا۔ باقی رہی یہ بات کہ ابن ام مکتوم نے آنحضرت صلعم سے تعلیم قرآن کی درخواست کی اور اپنے اعراض فرمایا تو یہ بات ازروئے روایت بھی ثابت نہیں۔ اور ازروئے قرآن اس کے ضعف کا جو حال ہے وہ نمایاں ہے۔ مزید تفصیل آگے آئے گی۔

[یہی] [سدا ہرنا چاہتا ہو] — یعنی آنحضرت صلعم کی صحبت اور آپ کی دعا کی برکت سے۔

[یہی] [وہ بیان کرنا چاہتا ہو] — یعنی قرآن سے اور پیغمبر کی نصیحتوں سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہو۔

[استغنیٰ] بے پروا ہوا — یعنی تزکیہ و تذکرہ اور انابت و خدیت سے — ان چیزوں کا ذکر اس لئے حذف کر دیا کہ ماقبل و مابعد کا تقابل اس پر دال تھا۔ [تصلیٰ] دراصل متصلہ تھا۔ یہ صداد سے ہے جس کے معنی

متوازی اور مقابل کے ہیں۔ عام بول چال میں کہتے ہیں داری بجمداد داری
پس تصدائی کے معنی ہوئے تعرض کرنے کے۔ یہ توئی کا ضد ہوا۔

[وما علیک الا یزگی] یعنی اگر وہ سدھرنہ چاہے تو اس کا بار الزم نہیں۔
[یسع] وہ دوڑ کر آتا ہے — لیکن اس سے بڑھ کر آنے سے وہ دوڑنا مراد نہیں
ہے جو پاؤں سے ہوتا ہے۔ یہ دل کے بیتا بنہ شوق کے لئے ایک پُرکنا یہ
طریقہ تعبیر ہے۔ موقع کلام اس پر دال ہے۔ نیز وہو یخشیہ سے بھی اس پر روشنی
پڑتی ہے۔

[یخشیہ] ڈرتا ہے — بظاہر ایک جامع اور مطلق لفظ ہے، لیکن
خوف قیامت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ سابق سورہ میں بالکل واضح کر دیا ہے
انما انت منذر من یخشاہا۔ تم تو بس انہی کو ڈرانے والے ہو جو قیامت
سے خوف کھاتے ہیں۔

[تلثہ] دراصل تلثہ ہے — تلثہ عند کے معنی ہیں اس سے نافل
ہو گیا۔ الہامی عند ذلک کے معنی ہوئے۔ مجھے فلاں چیز نے اس سے پھیر لیا اور میں
اس کی طرف توجہ نہ کر سکا۔ عقبہ بن بجیر کا شعر ہے

لحافی لحاف الضیف البیتہ ولہ یلہی عن غزال مقنع

میرے دروازہ پر اگر کوئی تھماں اتر پڑتا ہے تو میرا دل بچھونا تھماں کا اور نہ بچھونا اور

میرا گھر نہاں کا گھر بن جاتا ہوا اور کوئی برقعہ پوش ہر فی (نازنین) مجھے اس سے غافل نہیں کرتی۔

۴۔ اِن آیات کا موقع نزول و واقعہ کی ضلی تصویر

یہ آیتیں اس موقع پر نازل ہوئی ہیں جب اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ آنحضرتؐ منکرین کے پیچھے وقت نہ ضائع کریں اور اپنی تمام توجہ اور سرگرمی کا مرکز مسلمانوں کو بنائیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ابتداء میں آنحضرتؐ صلعم کو یہ حکم ہوا تھا کہ آپؐ اپنے اپنے قوم کے ان سرداروں کو دین حق کی دعوت دیں جو قوم میں دینی پیشوائی کے منصب پر فائز ہیں اور ساتھ ہی آپؐ کو یہ ہدایت بھی کر دی گئی تھی کہ اگر یہ لوگ اعراض کریں اور کفر و انکار پر جم جائیں تو آپؐ ان کو چھوڑ کر صرف مسلمانوں کے ساتھ مشغول ہو جائیں اور اپنا سارا وقت انہی کی تعلیم و تربیت پر صرف فرمائیں۔ بعض ابتدائی آیات میں اس معاملہ کے تمام مراحل کی پوری تفصیل کر دی گئی تھی۔

وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ
وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ
اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ. فَإِنْ
عَصَوْكَ فَقُلْ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا

اور اپنے قریب رشتہ داروں کو خدا کے
عذاب سے ڈراؤ اور جن مومنین نے تمہاری
پیروی کی ہے ان پر شفقت کرو پس
اگر تمہارے رشتہ دار تمہاری بات نہ

تَعْمَلُونَ - وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ
 الرَّحِيمِ - الَّذِي يَرْزُقُكُمْ
 حِينَ تَقُومُونَ - وَتَقْلُبُونَ
 فِي السُّجُودِ -
 مانیں تو تم کہہ دو کہ میں تمہارے فعل
 سے بری ماہوں اور خدا کے عزیز و رحیم
 پر بھروسہ کرو جو تم کو دیکھتا ہے جب تم
 اٹھتے ہو اور (دیکھتا ہے) ناز یوں میں
 تمہاری آمد و شد کو۔

اس ہدایت کے بموجب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ و دعوت میں مشغول ہوئے
 لیکن قوم کی طرف سے آپ کی دعوت کا جواب تکبر اور گھمنڈ کے انکار کے
 ساتھ دیا گیا۔ تاہم آپ بد دل نہ ہوئے، محبت کے جوش اور دعوت حق کی سرگرمی
 میں، اعراض و انکار کی ان تمام سختیوں کو جھیلتے رہے۔ آپ کو توقع تھی کہ یہ بیگانگی
 عارضی ہے جلد وقت آئے گا کہ یہ لوگ آپ کی باتیں مان لیں گے چنانچہ غدار
 و مخالفت کے یہ جان میں وہ لوگ جتنے ہی آپ سے دور پھٹتے جاتے آپ محبت و
 رافت کے جوش میں اسی قدر ان سے قریب ہوتے جاتے۔ اور اس کے چند
 خاص اسباب تھے۔

اولاً محبت و شفقت کا وہ بے پایاں جذبہ جو رحمت للعالمین کے ساتھ
 مخصوص تھا، اور جس نے آپ کی نگاہوں میں دشمنوں کو عزیزوں سے زیادہ

محبوب بنا دیا تھا۔

ثانیاً رسالتِ عظمیٰ کے فرائض کی ذمہ داریوں کا احساس۔
 ثانیاً یہ خیال کہ طاقتوروں اور دوہمتندوں کا ایمان دینِ حق کی تائید و تقویٰ
 کا باعث ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر، حضرت عمر، اور حضرت
 حمزہ رضی اللہ عنہم اور بعض دوسرے سابقین الاولون کے ذریعہ سے آپ کے
 اس خیال کی تصدیق فرمادی۔

رابعاً یہ اندیشہ کہ مبادا ادائے فرض کی راہ میں جو صبر و جہاد مطلوب ہے
 اس میں کسی طرح کی کوتاہی ہو جائے۔
 یہ سب باتیں اپنی جگہ پر بالکل صحیح تھیں۔ رافت و رحمت کے بے پایاں
 جذبہ اور ادائے فرض کے حقیقی جوش کا تقاضا یہی تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسا ہی
 کریں لیکن اس معاملہ کے بعض پہلو ایسے تھے جو مقامِ نبوت کے شایانِ شان
 نہ تھے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے روک دیا۔ اولاً تو اسمیں
 لوگوں کے حقوق سے متوڑی سی بے پروائی کا اندیشہ تھا جو آپ کی توجہ کے
 اصلی مستحق تھے یعنی مومنین خالصین، ثانیاً اس سے نبوت کے اس وقار کو
 بھٹیس لگتی جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے صرف سرِ بلند ہی اور برتری ہی پسند

کی ہے۔ سچی اور جھکاؤ کبھی نہیں چاہا ہے۔

اسی وجہ سے قرآن مجید میں آپ کو متعدد مقامات میں صرف مومنین سے ملنے کی تعلیم و تربیت میں مشغول ہو جائیگا حکم دیا گیا۔ منکرین کے پیچھے وقت ضائع کرنے اور ان پر غم کھانے سے روکا گیا ہے۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسًا عَلَىٰ
أَشَاقِہِمۡ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوا بِہٰذَا
الْحَدِیثِ اَسْفَاۗ (آف ۶)

پس شاید تم ان لوگوں کے پیچھے مار غم
کے اپنی جان ہلاک کر ڈالو گے اگر یہ
اس بات کو نہ مانیں گے۔

وَاصْبِرْ نَفْسًا مَّعَ الَّذِیۡنَ
یَدْعُوۡنَ رَبَّہُمۡ بِالْغَدۡۃِ
وَالْعِشَیِّ یُرِیۡدُوۡنَ وَجْہَہٗ
وَلَا تَعۡدُ عَدۡۡۡۡکَ عَنْہُمۡ
تُرِیۡدُ زِیۡنَۃَ الْحَیۡوۃِ الدُّنْیَا
وَلَا تُطِيعُ مَنْۢ لَّغَفَلۡنَا قُلُوبَہٗ
عَنِ ذِکۡرِنَا وَاَتَّبَعَ کَہۡوَلُہٗ
وَكَانَ اَمۡرُہٗ فُرُطًا

اور (اے پیغمبر) اپنے آپ کو ثابت قدم
رکھو، ان لوگوں کے ساتھ صبح و شام
اپنے رب کو پکارتے ہیں اسکی رضا طلبی
میں اور دنیاوی زندگی کی زینت کی
کھوج میں تمہاری نگاہیں ان سے
ہٹنے نہ پائیں اور تم ان لوگوں کی بات
پر کان نہ دھرو جن کے دل ہم نے
اپنی باد سے غافل کر دیے ہیں اور

وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَن جَهِدْ
جہنوں نے اپنی غم خوئی کی پیروی کی ہے

شَاءَ فَلْيُؤْمَرْ وَمَن شَاءَ
اور جن کا معاملہ جوت سے بڑھ گیا ہے کہہ کر کہ

فَلْيَكْفُرْ.....
حق تھارے پر خدا کی جانب ہے پس کفر

(۲۸ - ۲۹ کہن)
جی چاہے ایمان لائے اور جو جی چاہے کفر کرے

فَقَوْلَ عَفْوَ هُمْ مَّا نَتَبَلَّغُهُم
پس تم ان سے اسواض کرو تم کو کوئی

(الذاریات ۵۴)
ملا مت نہیں ہے۔

ان آیات سے واضح ہے کہ جب کبھی ایسا ہوا کہ جوش تبلیغ و دعوت میں آنحضرت صلیع نے انہماک و سرگرمی کی وہ حالت اختیار کر لی جو حد اعتدال سے کچھ متجاوز ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو روک کر جادہ اعتدال پر کھڑا کر دیا۔ انہی حالات کے اندر اتفاق سے یہ ابن ام مکتومؓ والا واقعہ پیش آگیا۔ وحی الہی تعلیم و تربیت کیلئے مناسب حال و اوقات کی قطعاً ہی ہستی تھی۔ پس واقعہ ایک ایسی سورہ کے نزول کا باعث بن گیا جو اغنیاء کی زبرد و توزیح، غنیوں کی مدح و ستائش اور دل شکستوں کی دلداری و ہمدردی پر ایک بلند ترین خطبہ اور جامع ترین موعظت ہے۔ اور آنحضرت صلیع تبلیغ و دعوت میں کبھی کبھی جو اصرار و الحاح کی شکل اختیار کر لیتے تھے اس پر بھی اس میں نہایت واضح لفظوں میں تنبیہ ہو گئی کہ آپ مکررین کے پھو

اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ وہ اپنی جگہ سے ہٹنے والے نہیں ہیں۔ صرف مومنین کی اصلاح و تربیت میں لگیں، جو آپ کی شفقتوں کے اصلی مستحق ہیں۔

واقعہ کی اصلی صورت یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کے پاس سادات قریش بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ ان کو تبلیغ و دعوت فرما رہے تھے۔ اسی سچ میں ابن ام مکتوم آگئے۔ آنحضرت صلعم کو اندیشہ ہوا کہ اب یہ بدک جائیں گے اور کہیں گے تم نے چند اصول اور غریبوں کو طمع دلا کر اور بیوقوف بنا کر پھنسا رکھا ہے اور اب ہمارے لئے دام بچھاتے ہو، تو ہم تو اس وقت تک تمہارے پیرو نہیں ہونے کے جب تک تم ان کو اپنی پیروی سے خارج نہ کرو، ہم اشراف ہو کر ان اراذل کی سطح پر نہیں اتر سکتے۔

آنحضرت صلعم کا یہ اندیشہ بالکل بجا تھا۔ سادات قریش اس خیال کو بار بار ظاہر کر چکے تھے۔ قرآن مجید نے کئی جگہ اس کا حوالہ دیا ہے۔

قَالُوا الْاَوَّلٰمِنْ كَمَا اٰمَنَ
جواب دیتے ہیں کیا ہم ایمان لائیں
الْاٰخِرَہَا (بقدرہ ۱۳)

جس طرح یہ بیوقوف ایمان لائے ہیں۔
دوسرے مقام پر فیصل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

وَاَنْذِرْ رِبِّہِ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ
اور اس کے ذریعہ ان لوگوں کو شہداء کرو

اَنْ يُخْشِرُوْا اِلٰى رَبِّهِمْ لَئِنْ
 هُمْ مِنْ دُوْنِهٖ وَنِيَّ وَلَا
 شَفِيعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ وَلَا
 تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ
 رَبَّهُمْ بِالْغَدَاوَةِ وَالْعَنَى
 يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهُ مَا عَلَيكَ
 مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ
 وَمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ
 مِنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ
 فَتَكُوْنَ مِنَ الظَّالِمِيْنَ
 وَلَٰكِنَّ الْاِيَّكَ فَتَنَّاۤ اَبْعَضَهُمْ
 بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْا اَهُوَ كَا
 مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنْ
 بَيْنِنَاۚ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ
 بِالشَّٰكِرِيْنَ- وَاِذَا جَاۤءُكَ

جو ڈرتے ہیں کہ اپنے رب کے پاس جمع
 کئے جائیں گے اور اس وقت خدا کے
 سوا نہ ان کا کوئی دوست ہوگا اور
 نہ سفارشی۔ تاکہ وہ پرہیزگاری اختیار
 کریں۔ اور نہ دھتکار و ان لوگوں کو
 جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے
 ہیں اسکی رضا جوئی میں۔ تم پر ان کی
 جواب دہی کچھ نہیں ہے اور نہ تمھاری
 جواب دہی کچھ ان پر ہے کہ تم ان کو
 دھتکار کر نالاموں میں بنائو۔ اور اسی
 طرح ہم نے بعض کو بعض سے آزمایا
 تاکہ وہ کہیں کیا ہی لوگ ہیں جن پر اللہ
 نے ہم میں سے فضل کیا ہے کیا اللہ
 شکر گزار بندوں کو نہیں جانتا اور
 جب تمھارے پاس آئیں وہ لوگ

الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا
 فَقُلْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ
 رَبُّكُمْ عَلَيَّ نَفْسِي الرَّحْمَةَ
 أَنَّهُ مَنْ عَمِلَ مِنكُمُ سُوءً
 بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِن
 بَعْدِهِ وَأَصْلَحَ فَإِنَّهُ
 خَفُوفٌ رَحِيمٌ (۹۱-۹۲) ^{نہاں}
 خَاصِدًا عِمَّا تَوْمَرُوا عَنِ
 عَنِ الْمَشْرِكِينَ إِنَّا كَفِينَاكَ
 الْمُسْتَهْزِئِينَ الَّذِينَ
 يَجْعَلُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا
 آخَرَ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ
 وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكَ
 يَضِيقُ صَدْرُكَ
 بِمَا يَقُولُونَ (۹۳-۹۴) ^{انجی}

جو ایمان رکھتے ہیں ہماری آیتوں
 تو کہو تم پر سلامتی ہو تمہارے پروردگار
 نے اپنے اوپر رحمت واجب کر لی ہے
 کہ جو کوئی تم میں سے براہِ نادانی کوئی
 برائی کر بیٹھے پھر اس کے بعد توبہ
 کرے اور اپنی حالت کی اصلاح کر
 تو بیشک وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔
 پس تم کو جس بات کا حکم ملے، کھو لکر
 سناؤ اور مشرکوں سے منہ پھیر لو۔ او
 مذاق اڑاؤ انہوں کیلئے جو اللہ کا چھوٹا
 ٹھہرتے ہیں ہم تمہاری طرف سے
 بس ہیں پس عنقریب ان کو معلوم
 ہو جائے گا اور ہم کو معلوم ہے
 کہ تم ان کی باتوں سے دل تنگ
 ہوتے ہو۔

آنحضرت صلعم اپنی رافت و محبت کی وجہ سے تمام غبار و مساکین کے
 بلجا و ماویٰ تھے اور بوجہ شدت غیرت کی بھی نہیں گوارا کر سکتے تھے کہ آپ کے ان
 صحابہ کی توہین ہو جن کو کسی طمع دنیاوی نے نہیں، محض طلبِ رضاے حق
 نے آپ کے ارد گرد کھٹا کر دیا ہے۔ پس اس موقع پر عبداللہ بن ام مکتومؓ کے آجائے
 سے آپ کو اصلی اندیشہ یہی ہوا کہ یہ اشقیاء ان کی پھٹی حالت دیکھ کر اس کو صفائے
 پر زبانِ طعن و راز کرنے کا ایک بہانہ بنالیں گے اور ان کی توہین کریں گے۔
 پس آپ نے جو کچھ کیا غیرت حق اور مصالحِ تبلیغ و دعوت کے تقاضے سے کیا
 لیکن اسی سے یہ امر بھی واضح ہو گیا کہ آنحضرتؐ جوشِ تبلیغ و دعوت میں
 اپنے حدود سے کسی قدر آگے نکل گئے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس موقع
 پر آپ کو تنبہ کر دیا کہ اپنے فرض سے زیادہ ذمہ داری اٹھانی ہے۔ اور کلام
 کا اسلوب ایسا اختیار فرمایا جس سے بظاہر عتاب مقرر ہے، لیکن عتاب
 کا اصلی رنج کفار و منکرین کی طرف ہے۔ آنحضرتؐ صلعم کی طرف نہیں ہے۔
 آپ کی تو اس میں تعریف کی گئی ہے اور ساتھ ہی آپ کے صحابہ کی بھی دلدادہی
 کی گئی ہے۔

حاصلہ کی اصلی نوعیت کو ایک مثال سے سمجھو۔ فرض کرو ایک نہایت

مستعد اور ذمہ دار چرواہا ہے، اس کے گلے کی کوئی فریہ بھیر گلے سے الگ ہو کر کھو جائے
 چرواہا انکی تلاش میں نکلے۔ ہر قدم پر اسکی کھر کے نشانات ملتے جا رہے ہیں جنگل کے
 کسی گوشہ سے اسکی آواز بھی سنائی دے رہی ہے اور اس طرح وہ کامیابی کی امید میں دور تک
 نکل جاتا ہے اور اپنے اہلی گلے کو تھوڑی دیر کیلئے غافل ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر کے بعد جب واپس لوٹتا
 ہے۔ آقا اس کو ملامت کرتا ہے۔ کہ ”تم پورے گلے کو چھوڑ کر ناحق ایک دیوانی
 بھیر کے پیچھے ہلکان ہوئے اس کو چھوڑ دیتے بھیر یا کھا جاتا وہ اسی کی سختی تھی، بتاؤ
 اس میں عتاب کس پر ہوا، چرواہا ہے پر یا کھوئی ہوئی بھیر پر۔ ظاہر ہے کہ کھوئی ہوئی
 بھیر پر چرواہا ہے اور گلے کی تو اس میں زیادہ سے زیادہ دلدادگی ہوئی۔ بالکل یہی
 صورت معاملہ یہاں بھی ہے۔ عتاب کا روئے سخن بظاہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف
 ہے۔ لیکن خفا کی تمام زور منکرین و معاندین پر پڑتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے تو اس
 عتاب کے اندر شفقت و التفات کی نہایت جاں نوازاویں پنہاں ہیں۔

تعبیر کے سورہ کا یہ مفہوم نہایت واضح ہو نیکی باوجود بعض مفسرین سے مخفی
 رہ گیا اور وہ طرح طرح کی غلط فہمیوں میں پڑ گئے۔ ہم آگے کی فصلوں میں ان
 غلط فہمیوں کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ وبیلا اللہ (التوفیق)۔

۵۔ ایک غلط فہمی کا ازالہ

جہاد سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سرداران قریش میں سے کسی سے تخلیہ میں باتیں کر رہے تھے۔ آپ نے اس کے سامنے اسلام پیش کیا تھا اور توقع تھی کہ وہ قبول کر لے گا کہ اسی بیچ میں حضرت عبداللہ بن ام مکتوم آ گئے۔ آنحضرت کی نظر پڑی تو آپ کو ان کا ایسے وقت میں آنا ناگوار ہوا کہ یہ قرشی کہنے لگا کہ خیمہ کے پیرو اسی قسم کے اندھے بہرے اور غریب و بے نوالوگ ہیں اس پر یہ آیت اتری۔

یہ تاویل حضرت جہاد کی تاویل ہے۔ اور جیسا کہ ہم پچھلی فصل میں بیان کر چکے ہیں، قرآن مجید کے الفاظ سے یہ بالکل ظاہر ہے۔ لیکن بعض لوگوں کو اس واقعہ کے بارہ میں بعض غلط فہمیاں ہو گئی ہیں وہ کہتے ہیں کہ ابن ام مکتوم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلیم و ارشاد کی درخواست کی اور آپ نے ان سے اعراض فرمایا اس پر یہ عتاب نازل ہوا اور اس قول کو بعض اکابر سلف منسوب کرتے ہیں۔ چنانچہ بعضوں نے حضرت عائشہ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت کسی قرشی سردار سے باتیں کر رہے تھے کہ اسی بیچ میں ابن ام مکتوم نے پہنچ کر

درخواست کی کہ مجھے کچھ نصیحت فرمائیے۔ ان کی یہ بے موقع درخواست آپ کو ناگوار ہوئی اور یہ ایت اتری۔ بعض لوگ انہی حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ غلبس میں ابوہبل اور عتبہ بن ربیع جیسے جیسے صنادید قریش شریک تھے۔ بعض لوگ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ، عتبہ بن ربیع عباس بن عبدالمطلب، ابوہبل بن ہشام سے باتیں کر رہے تھے کہ ابن اکثمؓ نے اگر درخواست پیش کی کہ علینی مہا علمک اللہ (اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو علم بخشا ہے اس میں سے کچھ مجھے بھی سکھائیے) آپ کو ان کی یہ بے محل مداخلت ناگوار ہوئی اور اس پر یہ عتاب نازل ہوا۔ بعض لوگ حضرت صفاک سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ اشرف قریش میں سے کسی سے گفتگو فرما رہے تھے کہ ابن اکثمؓ پہنچے اور انھوں نے اسلام کے متعلق بعض باتیں پوچھیں۔ بعض روایات میں ہے کہ ابن اکثمؓ ایسے وقت میں آنحضرت ﷺ کے پاس پہنچے کہ آپ عتبہ و شیبہ سے باتیں کر رہے تھے۔ ایک روایت ابو مالک سے ہے کہ آپ کی گفتگو امیر بن خلف سے تھی۔ بعض لوگوں نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت ﷺ ابی بن خلف سے باتیں کر رہے تھے۔

ان تمام روایات پر غور کرنے سے ایک امر واضح ہے کہ یہ سب ایسے

لوگوں پرنتی ہوتی ہیں جن میں سے کوئی شریک واقعہ نہیں تھا۔ پس اگر انکی صحت تسلیم بھی کرنی جائے تو بھی ان کی نوعیت استنباط کی ہوگی، خبر کی نہ ہوگی۔ پھر ان میں باہم گراس قدر اختلاف ہے کہ ان کی حیثیت صرف اوہام کی رہ جاتی ہے۔ واہمہ نے ایک تاویل اختراع کی اور جھٹ اس کے لئے ایک قصہ کا جامہ تراش لیا گیا اور اس کی نسبت ان لوگوں کی طرف کر دی گئی جن کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ باعتبار سند یہ تمام روایتیں نہایت ضعیف ہیں ان میں سے ایک بھی قابل اعتماد نہیں۔ اور قرآن مجید سے بوجہ ذیل ان کا غلط ہونا آشکارا ہے۔

۱۔ آیت کے الفاظ میں کہیں نہیں ہے کہ آنحضرت صلعم نے نابینا کو دیکھ کر تیوری چڑھائی یا اس کے سامنے ترش رو ہوئے (جیسا کہ بعضوں نے کہا) اور اگر آپ ایسا کرتے بھی تو ایک نابینا کو اس ترش روئی کا کیا احساس ہوتا! آپ کی آزدگی کا باعث محض ان کا آنا تھا کیونکہ اس سے ان سرکشوں کو موقع مل رہا تھا کہ آنحضرت صلعم کے صحابہ پر طعن کریں اور آپ کی مخالفت کا ایک بہانہ پیدا کر لیں۔ مکی زندگی میں آنحضرت صلعم کی تمام دعوت کا تعلق توحید معاد اور دشرک سے تھا اور یہ اس درجہ قطعی اور واضح مسائل تھے کہ مخالفین

ان کے جواب میں معارضہ کا کوئی پہلو شکل ہی سے پاتے اس لئے ہمیشہ اس گھٹات میں ہے کہ اگر مجاہدہ کا کوئی موقع نہیں ملتا تو استہزا و استخفاف ہی کا کوئی نکتہ ڈھونڈ نکالیں اور یقیناً عبداللہ بن ام مکتوم کے اس موقع پر آجانے سے ان کی یہ غرض پوری ہو رہی تھی۔

۲۔ (وَمَا يَدْرِيكَ لَعَلَّهِ يَنْكِهُ اَوْ يَدْرِيكَ لَعَلَّهِ يَنْكِهُ) اس امر پر

نہایت واضح دلیل ہے کہ آنحضرت صلیع کویہ بات بالکل نہیں معلوم تھی کہ نابینا کا نام طلب علم اور حصول ہدایت کے لئے تھا۔ اگر یہ بات آپ کو معلوم ہوتی، آپ نہایت پیشانی سے اس کا استقبال کرتے۔ کیونکہ طلب علم و ہدایت سے بڑھ کر پیغمبر کو کوئی چیز محبوب نہیں ہو سکتی۔ و ما یدریک لعلہ یزکی کے اسلوب ہی بات چیتی ہے کیونکہ اس اسلوب کو اگر خوب پھیلا دے تو پوری بات یوں ہوگی، تم آزر دہ ہوئے کہ اسکا آنا ایک ایسی حالت میں ہوا جو تمہیں ناپسند ہے حالانکہ تمہیں کیا خبر ممکن ہے وہ اپنے ساتھ کوئی ایسا مقصد لیکر آیا ہو جس میں تمہارے دل کی صفائی خوشی پوشیدہ ہو۔

غرض قرآن مجید سے یہی طرح نہایت نہیں کہ آنحضرت صلیع کویہ بات معلوم تھی کہ نابینا کا نام تعلیم و تذکر کے کسی دینی مقصد کے لئے ہے اور اس کے باوجود اپنے ناخوشی کا اظہار کیا ہو۔

۴۔ (وما علیہ الا یزکی) سے نہایت واضح طور پر ثابت ہے کہ تبلیغ و دعوت کے معاملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہماک کی غیر معتدل حالت اختیار کر لی تھی۔ چنانچہ اس پر آپ کو ہدایت ہوئی کہ اگر یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو اس کی باز پرس تم سے نہ ہوگی کہ غور و مخور کو ان کے ایمان کیلئے تم ان کے پیچھے چمٹے رہو۔ اس معنوں کی آیتیں قرآن مجید میں بہت ہیں۔ مثلاً "لست علیہم بمضبط" تم ان پر دروغہ بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو۔ "فان عنہم فمانت بملوہم ان سے اعراض کرو تم کو کوئی فلاح نہیں۔ فان یولوا فافاننا علیہم" البلاغ المبین اگر وہ اعراض کر جائیں تو کچھ غم نہیں تم پر تو صرف کھو لکر بنیادینے کی ذمہ داری ہے۔

ان آیات کا حاصل مطلب سامنے رکھ کر زیر بحث آیت پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ اس میں بانداز عتاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس بوجھ کو ہلکا کیا گیا ہے جو تبلیغ و دعوت کے عشق میں اپنے اپنے سر پر اٹھالیا تھا۔ یقیناً عتاب کا یہ انداز اس عتاب سے بالکل مختلف ہے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ہونا چاہئے تھا اگر اپنے واقعہ کسی کمزور مسلمان سے بنیاد تحقیر اعراض کیا ہوتا۔ پھر امانت استغناء فانت تصدتی کے کڑے سے واضح ہے کہ سرداروں اور اغیار کے ساتھ

آنحضرت صلعم کا یہ اعتقاد محض عشق و محبت اور جوش تبلیغ کا نتیجہ تھا یہ بات نہ تھی کہ آپ
غبار کو حقیر سمجھتے رہے ہوں۔

۴۔ ان آیات کے بعد والے ٹکڑے یعنی کلام اٹھانے کے لئے متن آذکار میں سر
کی کھلی ہوئی تعلیم ہے کہ آنحضرت صلعم ان لوگوں سے بالکل بے پروا ہو جائیں
جو اللہ کی یاد سے بے پروا ہو گئے ہیں اور ان کی تالیف و مدح جو کی کیلئے ہرگز
اس قدر نیچے نہ اتریں جس قدر نیچے اترنا اپنے گوارہ فرمایا ہے۔ پھر فرمایا اَمَّا
مَنْ جَاءَكَ يَسْعًا وَ هُوَ يُخَيِّتُكَ فَانْتَ عَصَىٰ فَلْيُكَلِّمْهُ اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت
کی اس درجہ مشغولیت آپ کی اور کتاب الہی کی عظمت کے شایان شان نہیں ہے۔

۵۔ پھر وہ تمام روایتیں تسلیم بھی کر لی جائیں جن میں بیان کر کیا گیا ہے کہ ابن
ام مکتوم قرآن مجید سیکھنے آئے تھے، یا کوئی مسئلہ پوچھنا چاہتے تھے، یا طلب ہدایت
کے لئے آئے تھے جب بھی یہاں کسی واقعی عتاب کا کوئی موقع نہیں ہے۔ آئندہ
ہم اس کی مزید توضیح کریں گے۔

خلاصہ اس تفصیل کا یہ ہے کہ ان آیات اور ان کے پیش و عقب پر غور کرنے
سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں آنحضرت صلعم کو استغناء اور شایان شان ترفع کی
تعلیم دی گئی ہے اور نہایت بلند ترین اسلوب عتاب میں آپ کو تبلیغ و دعوت

میں غلطی نہ ہو سکتی ہے۔ پھر اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دلدادہی، غریبوں کی دلجوئی اور غنیوں کی تواضع کے نہایت لطیف پہلو ہیں جو آئندہ مباحث میں سامنے آئیں گے۔

(۶) پہلی غلطی سے غلطی

صحیح تاویل کے واضح ہو جانے کے بعد ان باتوں کے ذکر کرنے کی چند ضرورت نہیں ہے جو یکسر توہمات پر مبنی ہیں لیکن ہم ایک خاص امر کا ذکر یہاں ضروری سمجھتے ہیں تاکہ یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے کہ کمزور روایات پر اعتماد کرنے سے کیا کیا خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور ان سے کس درجہ احتیاط ضروری ہے۔ حضرت امام رازیؒ نہایت ذہین آدمی ہیں۔ وہ اس بات کو فوراً سمجھ گئے کہ یہاں غلطی اور عتاب کا کوئی موقع نہیں تھا لیکن چونکہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر آنحضرت پر عتاب ہوا اس لئے ان کو فکر ہوئی کہ کسی نہ کسی شکل سے عتاب کا کوئی موقع پیدا کریں، چنانچہ انھوں نے پورے مقدمہ کو از سر نو مرتب کیا اور پھر جن نتائج تک پہنچے انکی تفصیل سننے کے قابل ہے۔ وہ پہلے سوال قائم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر عتاب کیوں فرمایا حالانکہ بوجہ ذیل ستمی زجر و تنبیہ ابن مکتومؓ تھے؟

۱۔ مانا کہ ابن ام مکتوم نابینا تھے لیکن وہ سرداران قریش کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گفتگو کر معاملہ کی اہمیت کا اندازہ کر سکتے تھے۔ پھر ایسی حالت میں ان کو بیچ میں غلت کر لیا یقیناً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا کا باعث ہوا ہو گا اور یہ معصیت ہے۔

۲۔ یہ سلم ہے کہ اس وقت جو اہمیت سرداران قریش کے معاملہ کو تھی وہ اہمیت ابن ام مکتوم کے معاملہ کو نہ تھی۔ ابن ام مکتوم بخیر ضرورت رسالت سے فیضیاب ہو چکے تھے اور کفار سہو زبا لکل عروم تھے اس لئے ان سے زیادہ توجہ کے مستحق تھے۔ پھر ان کے اسلام سے بہتوں کے قبول اسلام کی راہ باز ہوتی۔ پس ایسی حالت میں ابن ام مکتوم نے مداخلت کر کے اسلام کی ترقی کے ایک نہایت مفید موقع کا خون کیا۔

۳۔ قرآن مجید میں وارد ہے ان الذین ینادونک من وراء الحجرات اکثرهم لا یعقلون جو لوگ تم کو حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں اکثرنا سمجھ ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کی تادیب و صلاح کا اختیار حاصل تھا اور آپ برابر مختلف امور پر صحابہ کو زبردستی فرمایا کرتے تھے۔ پھر ایک ایسے افر پر آپ کیوں معتوب ہوئے جس کا آپ کو اختیار حاصل تھا۔

حضرت امام رازیؒ ابن ام مکتوم کے مستحق زبردستی ہونے کے آئو وجہ بیان کر نیکی بفرماتے ہیں۔

کہ اس موقع پر اتنے اشکالات پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے بعد جواب کی تقریر یوں شروع کرتے ہیں۔

ان اشکالات کے دو جواب ہیں۔

اول یہ کہ اگرچہ معاملہ کی اصل حقیقت وہی تھی جو از پر مذکور ہوئی لیکن اس کی ظاہری شکل سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ آنحضرت صلیم دو تہذیبوں کو غریبوں پر مقدم کرنا چاہتے ہیں اس لئے آپ پر عتاب ہوا۔

ہمارے نزدیک یہ وجہ ہر چند قبح سے خالی ہے، لیکن صنعت سے محفوظ نہیں۔ یہاں یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو غیب کو جانتا ہے، اور اس کا عتاب ہمیشہ کسی بات سے روکنے کے لئے ہوتا ہے تو کیا یہاں پیغمبر صلیم کو صحابہ کی تنبیہ سے روکا گیا ہے حالانکہ اس بات کی آپ کو اجازت حاصل تھی۔ امام رازی کا دوسرا جواب یہ ہے کہ آنحضرت صلیم کے فعل کے اس ظاہری نتیجہ پر عتاب نہ ہوا ہو بلکہ واقعہ یہ بات ہوئی ہو کہ قرابت، شرافت، اور علوئے منصب کی وجہ سے آنحضرت صلیم کا دل ان سرواروں کی طرف مائل ہو گیا ہو اور ابن ام مکتوم چونکہ اندھے تھے اور رشتہ و قرابت کی کوئی دہنگی بھی آپ سے نہیں رکھتے تھے نیز شرف خاندانی کے اعتبار سے بھی فروتر تھے اس لئے

مکن ہے آپکے دل میں ان سے کچھ نفرت پیدا ہوگئی ہو۔ اور اس پر عتاب ہوا ہو۔
 اس دوسرے جواب کی نسبت بجز اس کے کیا کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ
 حضرت امام رازی پر ہم فرمائے، ام مکتوم ام المؤمنین حضرت خدیجہ الکبریٰ
 کی خالہ تھیں۔ اس تعلق کے بعد شرف و قرابت کی وہ کونسی بلندی باقی رہ گئی ہے
 جو ان کے بیٹے کو حاصل نہیں ہوگئی۔ پھر یہ کسی درد انگیز بات ہوگی کہ ایک پیغمبر
 ایک شخص سے اس لئے نفرت کرے کہ وہ اندھا ہے۔ اندھے سے زیادہ ہمدردی
 و غمگساری کا حق دار کون ہے۔ اور اگر پیغمبر بھی اس سے نفرت کرے گا تو اس کی
 دلدادگی اور محبت کے لئے کون آئے گا یہ بات تو ایک مومن کی شان سے
 بھی فروتر ہے۔ نبی اور رسول کا کیا ذکر!

غور کرو، معاملہ کی نوعیت کس قدر عجیب و غریب ہے۔ امام رازی پہلے
 وہاں میں ٹھیک بات پالیتے ہیں کہ یہاں آنحضرت صلعم پر عتاب کا کوئی موقع
 نہیں ہے لیکن پھر ان کو تفسیر کی وہ تمام روایتیں یاد پڑ جاتی ہیں جنہیں آنحضرت
 کو مورد عتاب ٹھہرایا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی بات بول اٹھتے
 ہیں جس کو سنکر آدمی کا کلیجہ کانپ اٹھے۔ انھوں نے اس بات کا تو خیال
 رکھا کہ اللہ تعالیٰ کو بے محل عتاب کے الزام سے بچالیں لیکن اس بات کو بالکل

بھول گئے کہ ان کے جوابے آنحضرت صلیعہ کے خلق عظیم کا دامن ایک سنگین الزام سے آلودہ ہو رہا ہے۔

لیکن یہ ساری مشکلات تفسیری روایات کی پیدا کردہ ہیں۔ جن لوگوں کی نظر قرآن مجید کے سیاق و سباق اور آنحضرت صلیعہ کے حالات زندگی پر ہے ان کے نزدیک اس تاویل اور ان تمام ضعیف روایات کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔

ان آیات کا ربط آگے سے

ان آیات کے اندر آنحضرت صلیعہ کو آپ کے بلند منصب کی طرف توجہ دلائی گئی تھی کہ آپ مغزوروں اور سرکشوں کے ساتھ الحاح و اصرار کی ایسی شکل اختیار نہ کریں جو آپ کے رتبہ سے فروتر ہو۔ صرف مومنین کے ساتھ مشغول ہوں جو آپ کی توجہ کے اہلی مستحق ہیں۔ یہ مضمون مقتضی ہوا کہ یہاں مختصر اس چیز کی رفعت شان بھی بیان کر دی جائے۔ جو آپ پر نازل کی گئی ہے۔ تاکہ یہ اچھی طرح واضح ہو جائے کہ جو لوگ ایسی گرانمایہ نعمت سے منہ پھیر رہے ہیں وہ اعراض ہی کے مستحق ہیں۔ فرمایا:-

كَلَّا اِنَّهَا تَكُنْ كِرَّةً (۱۱) فَمِنْ شَاءَ ذَكَرَكَ (۱۲) فِي صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ
 مَّرْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ (۱۳) بِيَايَدِنَا سَفِيحَةٍ (۱۴) كِرَامٍ بَرَكَةٍ (۱۵)
 قَتْلَ الْاِنْسَانِ مَا الْكُفْرُ (۱۶) مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهُ (۱۷) مِنْ
 نُّطْفَةٍ خَلَقَهُ فَقَدَرْنَا رَحْمَةً السَّبِيلِ نَسْكُ (۲۰) ثُمَّ اَمَّا نَدُّ
 فَاقْبَرُكَ (۲۱) ثُمَّ اِذَا شَاءَ الْاَشْرَارُ (۲۲)

کچھ نہیں! یہ ایک یاد دلانا ہے (۱۱) سو جس کا جی چاہے اس کو یاد کرے (۱۲)
 قابل ادب، بلند اور پاک اوراق میں (۱۳) (۱۴) دی رتبہ ایک منشیوں کے
 ہاتھ میں (۱۵-۱۶) براہِ آدمی کا یہ کتنا شکر ہے (۱۷) اسے کس چیز سے بنایا (۱۸)
 ذرا سے پانی سے اسے بنایا تو اس میں اندازہ رکھا (۱۹) پھر اس کی راہ اسے اُن
 کر دی (۲۰) پھر اسے مردہ کیا پھر اسے قبر میں رکھوایا (۲۱) پھر جب چاہے گا اسے
 اٹھائے گا (۲۲)

الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی تاویل

[کَلَّا] تبلیغ و دعوت میں آنحضرت صلیع نے جو غیر معتدل حالت اختیار
 کرنی تھی اور جس پر آپ کو اوپر کی آیت میں تنبیہ فرمائی گئی کَلَّا اس کو مزید

موکد کر رہا ہے۔ یعنی بے نیازی کی تعلیم کو یہ لفظ اور زیادہ زور و قوت کے ساتھ نمایا کر رہا ہے۔ اس کا پورا مضمون گویا یہ ہو گا کہ تمہیں ہرگز زیبا نہیں ہے کہ تم ان سے اس درجہ چمٹو۔ بعد کے ٹکڑے سے اسکی پوری توضیح ہو جاتی ہے۔ [اھاتن کرحۃ] اوپر لفظ ذکر کی گزر چکا ہے۔ ضمیر اسی کی طرف لوٹتی ہے۔ اس سے مراد قرآن اور اس کی آیات ہیں۔ پہلے ذکر کی کا لفظ تھا، بعد میں تن کرحۃ کا لفظ آیا ان دونوں کی رعایت مقتضی ہوئی کہ ضمیر مؤنث کی لائی جائے، یہ جملہ دلیل کے موقع میں ہے۔ لفظ کلا میں تعلیم استغفار کا جو مفہوم مضمر تھا، اس ٹکڑے نے اسکو کھول دیا۔

[فَمَنْ شَاءَ ذَكَرْهُ] یعنی جو یاد دہانی تم ان کو سنا رہے ہو جس کا جی چاہے اس کو قبول کرے۔ یہاں چونکہ متبادر مفہوم کا خیال رکھا اس لئے ضمیر مذکر کی لائے۔ کیونکہ بادل و ہلہ ذہن قرآن کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ یہ جملہ اھاتن کرحۃ کی تشریح کر رہا ہے۔ یعنی قرآن محض ایک یاد دہانی اور پیام ہے جس کا جی چاہے اس کو قبول کرے جس کا جی چاہے انکار کر دے۔ اگر اہ یا اصرار و الحاح کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہے بیہ مضمون قرآن مجید میں بار بار بیان ہوا ہے۔ اس جملہ میں نہایت ایجاز ہے۔ بات

کا حرف ایک حصہ مذکور ہوا ہے، مقابل کا دوسرا حصہ حذف کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ مذکورہ حصہ خود محذوف کو واضح کر رہا ہے۔ اگر اس محذوف کو کھول دیا جائے تو پوری بات یوں ہوئی، سو جس کا جی چاہے یاد کرے اور جس کا جی چاہے نہ یاد کرے، بعض مواقع پر اس مضمون کی تشریح ہو گئی ہے۔ فمن شاء فليؤمن ومن شاء فليكفر پس جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے۔

ا [صُحُفٌ] جمع ہے صحیفۃ کی۔ صحیفہ کے معنی ہیں لکھا ہوا ورق صحیفۃ التلس، صحیفۃ الجور وغیرہ نام اسی معنی کے اعتبار سے پڑے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ لفظ صیفہ سے مقبوض ہے۔ صیفہ چوڑی چکلی چیز کو کہتے ہیں۔ صیفۃ الجور صحیفۃ السلف صیفۃ الغنق نہایت مشہور استعمالات ہیں۔ لفظ اپنی جمع کی صورت میں بعض اوقات، کتاب کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ مثلاً رسول من الله يتلو صحفاً مطهرة۔ فی صحف، در اصل ہو فی صحف ہے۔ اوپر جس شے کا ذکر ہوا تھا اب اس کے اوصاف بیان ہو رہے ہیں۔ اوصاف مابعد کے بیان میں سند الیہ کا حذف ایک معروف اسلوب قرآن مجید میں اس کے شواہد بہت ہیں۔ کسی مقام پر ہم اس سند کو واضح کر چکے ہیں۔ اعادہ

کی ضرورت نہیں ہے۔

اور پریم نے جو تاویل بیان کی ہے۔ قرآن کی ان صفتوں پر غور کرو۔ انکے اندر بھی بعینہ وہی حقیقت بول رہی ہے۔ یعنی یہ قرآن جو اپنے رتبہ اور درجہ کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے، اس کو اس اصرار و الحاح کے ساتھ پیش کرنا ہرگز اس کے شایان شان نہیں ہے۔ پس آنحضرت صلعم کو جو استغفار کی تعلیم دی گئی تھی، قرآن کی ان صفات نے اس کی دلیل بیان کر دی۔

[مَرْفُوعَةً] اس لفظ میں بلندی اور درجہ دونوں کا مضمون پنہاں ہے۔ دوسرے مقام میں اس کی تشریح ہو گئی ہے۔ ثَلَا وَانْه فِي اٰه
الکتاب لدینا العلی حکیم دوسری جگہ فرمایا وَالْقُرْآنَ الْمَجِیدَ اور یہ
دونوں مضمون ”حقیقت“ ”مکرمۃ“ ہی کی تشریح ہیں۔

[مُطَهَّرَةً] یہ صفت بھی ”حقیقت“ صفت تکریم ہی کے ایک پہلو
کو واضح کر رہی ہے یعنی قرآن مجید شیاطین اور ارواح خبیثہ کے دسترس
سے بالکل محفوظ ہے۔ اسی مضمون کو دوسری جگہ بیان فرمایا ہے فی کتابنا مکنون
لَا یَمْسُهُ اِلَّا الْمُطَهَّرُونَ ایک اور مقام میں ہے بل هو قرآن
مجید فی لوح محفوظ اور جہاں جہاں قرآن مجید کو کتاب عزیز،

کہا ہے اس میں بھی عموماً اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

[مَسْفَقاً] مسافر کی جمع ہے بمعنی قاری و کاتب۔ سفر کے معنی قرأت و کتابت کے ہیں۔ یہ لفظ عبرانی زبان میں باقی ہے۔ اسکے اصل معنی زخم لگانے کے ہیں۔ اسی سے کتابت کا مضموم پیدا ہو گیا کیونکہ ابتدا میں جب کوئی چیز لکھنا چاہتے تو اپنی قلم سے اس کو کسی چیز پر کھودتے۔ پھر آہستہ آہستہ یہ لفظ قرأت و بیان کے معنوں کے لئے وسیع ہو گیا۔ عبرانی میں ۶۸۵ (سفر) قرأت و کتابت اور زخم لگانے کے معنی میں موجود ہے اور ۶۸۶ (سافر) کاتب، فقیر، امام اور قائد کے معنوں میں آتا ہے۔ اس لحاظ سے حضرت قتادہ کا یہ فرمانا بالکل صحیح ہے کہ سفرہ سے مراد قراء ہیں۔ نیز حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ سفرہ نبطی میں قراء کو کہتے ہیں۔ زخم لگانے کے معنی میں ہماری عربی زبان میں بھی مستعمل ہے۔ روئے کامصرعہ ہے۔

تسفیر موسیٰ الصلح المجاہد

اسی طرح کتب کا مادہ عربی زبان میں اپنے اصل معنی میں باقی رہ گیا ہے۔ [کراہ] یعنی اس امانت کے لئے پوری طرح قابل اعتماد ہیں۔ ان کی شرافت کی وجہ سے ان پر کسی طرح کا شبہ نہیں کیا جاسکتا۔

[بَیِّنَات] باری کی جمع ہے۔ بار اس شخص کو کہتے ہیں جو فرمانبردار اور اپنی ذمہ داری

کو ٹھیک ٹھیک پورا کرنے والا ہو۔ اس صفت نے ان کی امانت داری کے وصف کو اور زیادہ نمایاں کر دیا۔ اس مضمون کی طرف قرآن مجید کی مختلف آیات اشارہ کر رہی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے: نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ،

دوسرے مقام پر ہے: إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ، ذِي قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ مُّطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ

ان آیتوں کا مفاد قرآن مجید کی عظمت و شان کو بیان کرنا ہے کہ اس قدر بلند رتبہ اور اشرف چیز اس لئے نہیں ہے کہ اس اصرار و الحاح کی بات تھان لوگوں پر پیش کی جائے اور یہ لوگ اس سے اعراض کریں۔

علاوہ ازیں ان آیات سے قرآن مجید کی بعض نہایت اہم صفات روشن ہو گئی ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے پاس لکھا ہوا ہے، پڑھا جاتا ہے، ہر طرح کے اختلاط و امتزاج سے بالکل پاک ہے۔

ہاں ایک خاص بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ یہاں رفع، تظہیر اور صحیفہ وغیرہ کے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یہ تاثر ایسے حقائق کی تعبیر کے لئے اختیار کئے گئے ہیں جن کا تعلق ملا اعلیٰ سے ہے۔ ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ صرف

معاذ و نتیجہ ہے، باقی رہی انکی اصلی تاویل و تصویر تو یہ چیز اس مقام کے احوال و معاملات کے شایان شان ہوگی۔

[قَتَلَ الْإِنْسَانَ مَا أَكْفَرًا] انسان کے لفظ سے عموماً انسانوں کا غالب حصہ مراد ہوتا ہے یعنی کفار پس یا تو لام عہد کا ہوتا ہے یا یہ بتا دیا کہ کثرت پوری نیرغ پر ایک حکم لگا دیتے ہیں۔ فرمایا ان الْإِنْسَانَ نَطْلُو مَكْفَرًا اس کی مثالیں قرنجید میں بہت ہیں (قتل) اصل حقیقت سے ہٹ کر محض اظہار غضب کے لئے استعمال ہوا ہے (مَا أَكْفَرًا) میں اس غضب کا سبب بیان ہوا ہے اور انسان کی اس روش پر اظہار نفرت ہے۔

[مِنْ أَيْ شَيْءٍ خَلَقَ] یہ استفہام تحقیر کے لئے ہے۔ اس کے بعد انسان کی حالت بیان ہوئی ہے، یہ ٹکڑا اس کی تمہید ہے۔

[نُطْفَةٍ] تھوڑا سا بیجڑا ہوا پانی۔ ابوصترہ بولانی کا شعر ہے۔

فَمَا نَظْمَةٌ مِنْ حَبْنٍ نَفَاذٌ بِهْ جَنْبَتَا الْجُودَى وَاللَّيْلِ دَاسٌ

قرآن مجید میں ہے۔ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ مَاءٍ مَهِينٍ -

اس لفظ کی حقیقت پر غور کرو اور دیکھو بعث کے بارہ میں جو استبعاد لوگوں کو نظر آتا تھا اس کو اس نے کس طرح دور کر دیا ہے۔ کیونکہ اس سے صاف واضح

ہی کی طرف سے ہے کہ اس نے اعصار و قوی عنایت کئے اور پھر ان کے استعانت کرنے اور برتنے کا ڈھنگ بتایا۔ اور اس کیلئے تمام اسباب و مسائل فراہم کر دیئے۔ چنانچہ فرمایا ہے اللّٰذی خالق فسقوی واللّٰذی قد سر فھدای، جس نے خلق کیا پھر تسویہ کیا اور جس نے اندازہ ٹھہرایا پھر اس کی طرف رہنمائی کی۔ اس سے زیادہ واضح لفظوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی نقل فرمایا ہے ربنا اللّٰذی اعطے کلّ شئ خلقہ شئ ھدی ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اسکی خلقت بخشی پھر رہنمائی کی۔ اور یہ بات قرآن مجید نیز اصول فطرت سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے سامنے خیر و شر دونوں کی راہیں کھول دی ہیں اور دونوں کے سمجھنے اور پرکھنے کے لئے عقل و بصیرت بخش دی ہے، پس انسان جس کو چاہے، اختیار کرے۔ وہ ان میں سے کسی راہ پر مجبور نہیں کیا گیا ہے۔ فرمایا۔

فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا اِنَّا

هَدَيْنَا السَّبِيلَ اِمَّا

شَاكِرًا وَاِمَّا كَافُرًا

وہ نے اس کو سمیع و بصیر بنایا بیشک ہم نے اسکو ہدایت دی راستہ کی (واقع متقنی ہے کہ یہاں راستہ مراد خیر کا راستہ یا جا چاہا وہ شکر گزار بنے یا ناشکر۔

.....
دوسری جگہ فرمایا۔

وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا اور دل اور جیسا اس کو بنایا پس اس کو
فَالْهَمَّهَا جُوعًا وَتَقْوَاهَا بھمدی بدی اور کی کی کامیاب ہو جس نے
قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا وَقَدْ اسے صاف کیا اور ناکام ہو جس نے اس کو
حَابَّ مَن دَسَّاهَا آلودہ کیا۔

قرآن مجید اور عقل و نقل کی تمام شہادتیں اس بات پر متفق ہیں کہ تیسری ہمیشہ
اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے اور اس کا قانون یہ ہے کہ آدمی اپنی پسند سے
اپنے لئے جو راہ اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کیلئے اس راہ کو آسان کرتا ہے چنانچہ
فرمایا ہے۔

فَأَمَّا مَن آعطَىٰ وَاتَّقَىٰ وَ
صَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ فَسَنُيَسِّرُهُ
لِلْيُسْرَىٰ وَأَمَّا مَن أَبْغَلَ
وَاسْتَغْنَىٰ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَىٰ
فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرَىٰ
سو جس نے سخاوت کی اور ڈر ڈھلا اور
چھی بات کو سچ مانا، اس پر ہم سچ کر دیں گے
آرام دینے والی اور جس نے بخل کی اور
بے پروائی کی اور اچھی بات کو جھٹلایا اس پر
سچ کر دیں گے مشکل میں ڈالنے والی۔

پس اس مقام پر تاویل یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا، اس کو
برائی اور بھلائی کی تمیز دی اور اس کو اختیار بخشا کہ وہ ان دونوں راہوں میں سے

جس راہ کو چاہے اپنے لئے پسند کرے۔ ان میں سے کسی راہ پر اس کو مجبور نہیں کیا۔ اور اس کے تمام اعضا و قوتی اور اسباب کو اس کے ارادہ کے ماتحت کیا، ان میں سے کسی چیز کو اس کے ارادہ پر حاکم نہیں بنایا۔ اور یہ وہ سب سے بڑی نعمت و سر فرازی ہے جو انسان کو اپنے پروردگار کی طرف سے حاصل ہوئی۔ اس کی پوری تفصیل اپنے محل میں آئے گی۔

[فَأَقْبِرَکَ] قبرہ کے معنی میں اس کو دفن کر دیا۔ اور اقبِرہ کے معنی ہیں اس کیلئے قبر بنائی۔
[النَّشْرُ] کھول دیا۔ پھیلا دیا۔ پھینٹ دیا۔ باب افعال مبالغہ کے مفہوم کے لئے بھی آتا ہے۔ یہاں مطلب یہ ہو گا کہ دفن ہو جانے اور سڑکھل جانے کے بعد اس کو سیدھا اٹھا کھڑا کرے گا۔

۹۔ ان آیات کا ہی نظم و پیش و معیت تعلق

پہلے یہ بیان کیا کہ قرآن مجید نہایت بلند و برتر کتاب اور ارواحِ خبیثہ کی دسترس سے بالکل محفوظ ہے۔ اس کے بعد اس نعمتِ عظمیٰ سے انسان کی بے پروائی کی شاعت کو واضح کرنے کے لئے اپنی قدرتِ کاملہ کے پہلو بہ پہلو انسان کے عجز و درماندگی کا حال بیان کیا تاکہ کمالِ فضل و احسان

کے آئینہ میں انسان اچھی طرح دیکھ لے کہ باہمہ ضعف و عجز اس کی بدبختیوں اور ناپائیداری کا کیا عالم ہے۔

اور چونکہ اسلوب بیان مقتضی تھا کہ انسان ایمان و اطاعت کی راہ اختیار کرے اور اپنے پروردگار کی نعمتوں کا شکر گزار ہو اس لئے اس کے بعد فرمایا: (مساء کفر) انسان کتنا ناشکر ہے! یعنی ان تمام افضال و عنایات کے باوجود اسکی ناپائیداری کو کفر و عھیان کا معاملہ کتنا عجیب ہے:

[من نطفۃ] سے لیکر [فالقہر] تک غور کرو تو معلوم ہوگا کہ قرآن نے ان چند نقطوں کے اندر انسانی زندگی کے تینوں مرحلے، اول، وسط، آخر، پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دیئے ہیں۔

پہلا مرحلہ یہ ہے کہ انسان اس تھوڑے سے پانی سے پیدا ہوا، جو خدا عظیم و قدیر کی حکمت و قدرت سے تمام ہم کے اطراف سے چھن چھن کر جمع ہوا۔ اسکے بعد اس پر اللہ تعالیٰ کے تمام تصرفات جاری ہوئے۔ یہ تمام تفصیل جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، لفظ "نطفۃ" سے سمجھی جاتی ہے۔

مرحلہ وسطیٰ یہ ہے کہ انسان اپنے ارادہ و فعل کے تمام گوشوں میں جو کچھ کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی توفیق و تیسیر سے کرتا ہے، بنیر اس کے اس کو کسی چیز

پر بھی کوئی قدرت حاصل نہیں ہے۔

آخری مرحلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو مارتا ہے اور قبر میں رکھ دیتا ہے۔
اس سے انسان کی کمال بے بسی اور عجز و رماندگی کی حالت ظاہر ہوتی ہے۔
وہ یکسر اپنے پروردگار کے قبضہ و تصرف میں ہے۔

ان حالات کے بعد، جو خدا کی قدرت اور پروردگاری پر مختلف بہت
دلیل ہیں۔ یہ بات آپ آپ واضح ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ انسان کو اس کے اعمال
کا بدلہ دینے کے لئے ایک دن اٹھائے گا کیونکہ جو انسان مخلوق و مصنوع
ہے اور زندگی و معشیت کے تمام گوشوں میں خدا کی بخشی ہوئی توفیق کی رہنمائی
رکھتا ہے، عبت نہیں پیدا کیا گیا ہے۔ ضروری ہے کہ اس کے لئے پرسش
اور جزائے اعمال کا بھی ایک دن ظہور میں آئے۔

اب پورے سلسلہ پر غور کرو کہ انسان اپنے آغاز کے روز اول سے لیکر اپنے
اٹھائے جانے کے دن تک کس طرح عاجز و رماندہ ہے۔ اور تمام حالات
کس طرح اس کی بے بسی پر دلیل ہیں؟ پھر اس کے باوجود بھی اگر وہ اپنے رب کے بنے نیا
ہو جائے اور اس نعمت سے منہ پھیرے جو اس کی زندگی میں اس کے لئے
توفیق و رہنمائی کی سب سے بڑی روشنی ہے تو اس کی محرومیوں کا کیا حال ہوگا!

ان دلائل کے بعد کلام ان دلائل کی طرف متوجہ ہو گیا ہے جو انسان اپنے گرد و پیش دیکھتا ہے اور جن سے نہایت واضح طور پر ثابت ہو کہ وہ خدا مخلوق بندہ ہے اور اسی کی بخشی ہوئی روزی سے پلتا ہے۔ اور انکے ذکر کا منشا محض یہ ہے کہ انسان کی نافرمانی اور ناشکری کی شامت پوری طرح واضح ہو جائے۔
فرمایا:-

كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَا أَمَرُكَ (۲۳) فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلَى طَعَامِهِ (۲۴)
 إِنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا (۲۵) ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا (۲۶)
 فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا (۲۷) وَعَيْنًا وَقُضْبًا (۲۸) وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا (۲۹)
 وَحَلَلًا لِّقُلُوبِ غُلَبًا (۳۰) وَفَاكِهَةً وَأَبًّا (۳۱) مَتَاعًا لَّكُمْ
 وَلِأَنْعَامِكُمْ (۳۲)

ہرگز اس نے پورا نہ کیا جو اس نے فرمایا (۲۳) انسان اپنی غذا پر نگاہ کرے (۲۴)
 ہم نے پانی کو گرا یا (۲۵) پھر زمین کو بھاڑا (۲۶) پھر اسے اکائے اناج (۲۷) اور انگور
 اور ساگ (۲۸) زیتون اور کھجور (۲۹) گھنے بارغ (۳۰) اور میوے اور دروب (۳۱)
 تمہارے اور تمہاری مویشیوں کے برتنے کے لئے (۳۲)

۱۔ الفاظ کی تفسیر و محلوں کی تاویل

[کَلَّا] انسان کی بے پروائی اور نافرمانی پر زبردستی ہے۔ بعد کے الفاظ سے اس کی تشریح ہو جاتی ہے۔

[لَمَّا يَاقُض] یعنی اپنی نافرمانی کی حالت پر برابر قائم ہے۔

[مَا اَمْر] یہ فطرت کے الہام اور وحی و تنزیل دونوں کو عام ہے۔ خدا نے انسان کی فطرت میں شکر گزاری اور ہمدردی خلق کا جو جذبہ الہام فرمایا ہے اور انبیاء کے واسطے جو اوامر و نواہی بھیجے ہیں، سب اس کے تحت میں آجائینگے۔ [اِستَا] یہ اور اس کے بعد کے جملے طعام سے بدل کے محل میں واقع ہیں۔ یعنی انسان ان تمام چیزوں پر نگاہ کرے۔

[صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا] بہت زیادہ پانی بہایا۔ دوسری جگہ فرمایا ہے وَاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً ثَجَّاجًا۔

[وَشَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا] شق کا لفظ زمین کے لئے مختلف اعتبارات سے استعمال کیا گیا۔ (۱) جب بارش ہوتی ہے زمین کے مسامات اس کو پی لیں گے کے لئے کھل جاتے ہیں۔ (۲) زمین کو چاکر اللہ تعالیٰ نے اس میں نہریں اور

جو ہری وغیرہ کا خیال ہے کہ ابان مادہ ابن سے بروزن فعال مبالغہ کا صیغہ ہے۔ حالانکہ ان دونوں میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔ ابنہ مثنیٰ کے معنی ہیں۔ اس کو کسی بات کی تہمت لگائی۔ یہ انتہہ سے ہے جو اس گروہ کے لئے بولا جاتا ہے جو لکڑی میں ہوتی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ اب سے فعلان کا صیغہ ہے۔ ان دونوں کے درمیان نہایت گہری معنوی مناسبت موجود ہے۔ یہ مادہ عبرانی زبان میں یعیثہ اسی معنی میں پایا جاتا ہے ۵۵۵ (اب ب) ۵۵۶ (اب) ترکاری اور ۵۵۷ (اب)۔

(ایب) سبز بالی اور یہودیوں کے پہلے ہیمنہ ربیع کے لئے مستعمل ہے۔ اس لئے کہ وہ نباتات کی روئدگی اور نمو کا اولین ہیمنہ ہے۔ اس تفصیل سے یہ امر واضح ہو گیا کہ یہ مادہ عربی زبان میں متعل ہے۔ لیکن اشعار میں اس کا استعمال کم ہوا اس کی وجہ یہ ہے کہ لغت میں اس کے نہایت ہلکے مترادفات موجود تھے۔ لیکن جہاں ایک جامع لفظ کا استعمال ناگزیر اور حسن موقع نقضی ہو ایہ لفظ استعمال کیا گیا۔ یہاں مختلف وجوہ مقتضی تھے کہ یہی لفظ استعمال کیا جائے۔ اگلی فصل میں اس کی تفصیل آئیگی۔ پس یہ بات کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتی کہ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما اس لفظ سے ناواقف تھے۔ اس روایت کا پہلا حصہ منقطع ہے اور دوسرا حصہ مضطرب۔ اور وجوہ ذیل اس بات پر نہایت واضح

دلیل ہیں کہ یہ بالکل ضعیف ہے۔

۱۔ یہ سورہ کی ہے۔ مکی زندگی میں صحابہؓ کا اصلی مشغلہ قرآن مجید کا پڑھنا پڑھانا تھا۔ اگر یہ لفظ ان کو معلوم نہ تھا تو اس قدر طویل صحبت کے باوجود انھوں نے اسکو آنحضرت صلیم سے کیوں نہیں دریافت کیا۔ اور آنحضرت صلیم نے ان کو کیوں نہیں بتایا؟ کیا صحابہؓ قرآن مجید سے بالکل غافل تھے کہ جب آنحضرت صلیم کی وفات ہو چکی تو انھیں معلوم ہوا کہ یہ لفظ بغیر تحقیق کے رہ گیا۔ اور اس وقت ان کو اس کے عدم علم کا اعتراف کرنا پڑا!

۲۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زبان نہایت واضح اور سہل ہے۔ اشعار اور خطابات کی جو عام زبان تھی اسی زبان میں نازل ہوا۔ پھر عکاظ میں شعراء کے جو کلام پیش ہوتے، ان کے حسن و قبح کا فیصلہ قریش ہی کرتے۔ حضرت ابوبکرؓ کا شمار عرب کے مشہور سرداروں اور خطیبوں میں تھا اور حضرت عمرؓ تو گویا قریش کی زبان اور ان کے ترجمان تھے۔ کلام پر ان کی تنقیدیں معلوم ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ زبان کے معاملہ میں ان کا رتبہ کس قدر بلند تھا۔ پھر حیرت ہے کہ یہ ماہرین ادب و لغت قرآن مجید کے ایک لفظ سے بالکل بے خبر تھے۔

قرآن مجید عرب کی نہایت معروف اور کھلی ہوئی زبان میں اتر آتا کہ لوگوں کو اس کے ذریعہ دین کی دعوت دی جائے اور لوگ اس کی تعلیمات کو سمجھیں، اس بات کو خود قرآن مجید نے مختلف موقعوں پر مختلف انداز سے بیان کیا ہے۔ مثلاً فرمایا:-
 وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانٍ قَوْمِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ
 کو مگر اس کی قوم کی زبان کے ساتھ۔ ایک دوسری جگہ فرمایا:- إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ۔ ہم نے اس کو بنایا عربی قرآن تاکہ تم اس کو سمجھو۔
 پس یہ کیسے ممکن ہے کہ قرآن مجید ایسے الفاظ استعمال کرے جن کے معانی پڑنے بڑے صحابہ نہ مطلع ہو سکیں؟ یہ بات تو اس کے عربی مبین ہونے کو صریح منافی ہوگی!

۴۔ جن لوگوں نے یہ روایت گڑھی ہے انھوں نے اس کو اکابر صحابہؓ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ اور یہ معلوم ہے کہ جو لوگ صحابہؓ پر طعن کے شائق تھے وہ بیشتر بڑے صحابہؓ ہی کو تاکتے تھے۔

[متاعاً] متاع اصل میں مصدر ہے۔ پھر یہ بطور اسم ہر اس چیز پر استعمال ہونے لگا جو برتی جائے۔ یہیں سے ساز و سامان اور سرمایہ کے لیے بولا جانے لگا۔ اس لفظ کے اندر قلت مدت کا مفہوم بھی چھپا ہوا ہے۔ کبھی تو یہ

مفہوم تصریح کے ساتھ ظاہر کر دیا جاتا ہے اور کبھی اس میں مقدر ہونے کی وجہ سے نہیں ظاہر کیا جاتا۔ یہ بات قرآن مجید کے استعمالات بالکل واضح ہے۔ مَتَّاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ إِلَيْنَا مَجْمَعُهُمْ یعنی تھوڑے دنوں کے لیے دنیا کی زندگی میں برتنا ہے پھر ہمارے پاس لوٹائے جائیں گے پس یہاں مَتَّاعًا تَكْمِلُہیں صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ اس کو مصدر مانا جائے جیسا کہ قَتَحَكُمْ مَتَّاعًا حَسَنًا إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى میں ہم پاتے ہیں۔ اس شکل میں تاویل یہ ہوگی کہ یہ چیزیں ہم نے اسلئے پیدا کی ہیں کہ تم کو ان کے بہرہ مند کریں، دوسری شکل یہ ہوگی کہ اس کو حال مانا جائے یعنی درانحالیکہ یہ چیزیں تمہارا کرتے کے لیے ہیں لیکن باعتبار نتیجہ دو دنوں تاویس یکساں ہیں البتہ پہلی صورت میں اللہ تعالیٰ کی پروردگاری اور انعام کا پہلو زیادہ نمایاں ہوگا کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارادہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ اُس نے یہ سب کچھ انسان کو بہرہ مند کرنے کے لیے بنایا ہے۔

اشیاء مذکورہ میں باہمی ترتیب و نسبت

اس سورہ سے پہلے کئی تین سورتوں میں ان آیات کی مثالیں تھیں مل سکتی ہیں، ان پر ایک نگاہ ڈال لو۔ یہ چاروں سورتیں اپنے

مضامین کے اعتبار سے نہایت ملتی جلتی ہوئی ہیں۔ صرف اسلوب اور بیج کا فرق ہے۔ موقع کی رعایت سے ایجاز تفصیل اور ترتیب کے ڈھنگ بدل گئے ہیں۔ اصل حقیقت ہر جگہ ایک ہی ہے۔ اس سورہ میں اقتضائے مقام سے جو ترتیب ملحوظ ہے چند افظوں میں ہم اس کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

یہاں جیسا کہ واضح ہوگا الاقدام فالانعام کا اصول اختیار کیا گیا۔ یعنی ضرورت کے اعتبار سے جو شے بقدر زیادہ نمایاں اور اہم تھی، ترتیب میں اسکو اسی قدر اہم اور نمایاں جگہ ملی اور ایجاز و اختصار کی انتہائی رعایت کی گئی تفصیل اور استقصاء کا اسلوب ملحوظ رکھا گیا۔ چنانچہ پہلے ان چیزوں کا ذکر کیا، جو سیرابی کی زیادہ محتاج ہیں اور جن سے انسان کو جلد رزق حاصل ہوتا ہے۔ اگر بارش بکثرت نہ ہو تو یہ چیزیں وجود میں نہ آسکیں اور ان سے انسان محروم ہو جائے۔ حالانکہ انسان کی معیشت کا دار و مدار زیادہ تر انہی چیزوں پر ہے۔ یہ چیزیں تین قسم کی ہیں، غلہ، پھل، سبزیاں اور ترکاریاں۔ پس ان میں سے سب سے پہلے اناج کا ذکر کیا۔ یہ انسان کے سامان معیشت کا سب سے زیادہ جامع عنصر اور ذخیرہ کی چیزوں میں سب سے اہم ہے۔ پھر انکو رکھ کر ذکر کیا جو اس الاثمار ہے۔ نیز ذریعہ کی صورت میں ذخیرہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور بنیاد کی صورت میں ایک صالح اور

اور طیب شراب ہے۔ عرب ان اشیاء کی اس قدر تی ترتیب سے واقف تھے۔
عشی قیس کا شعر ہے :-

فاروی الزرع واعناہا علی سعة ماءھا اذ قسم
اس شعر میں اس نے اناج کے بعد انگور کا ذکر کیا ہے۔ اس لئے کہ
معیشت کی ضروری چیزوں میں جو جذبہ اہتمام وہ ان چیزوں کے لئے اپنے
اندر رکھتے تھے وہ دوسری چیزوں کے لئے نہیں رکھتے تھے۔

اس کے بعد قصب کا ذکر کیا۔ یہ ان تمام چیزوں کے لئے ایک عام
اسم ہے جو تروتازہ اور کچی حالت میں کھائی جائیں۔ قرآن مجید میں قریباً
یہی ترتیب بعض اور مقامات میں بھی ملحوظ ہے۔ مثلاً فرمایا۔ لنخرج بہ
حباً ونباتاً، تاکہ ہم اس کے ذریعہ اگائیں اناج اور نباتات۔ قصب
ان چیزوں کا بیان ختم ہو جاتا ہے جو جلد نفع پہنچانے والی اور زیادہ سیرابی و
ابپاشی کی محتاج ہیں۔ اس کے بعد دوسری چیزوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے
جو اولاً تو بدیر پھل لاتی ہیں ثانیاً سیرابی اور آبپاشی کی کچھ ایسی محتاج نہیں ہوتیں
عموماً صرف آسمان کی بارش ان کے لئے کفایت کر جاتی ہے۔ مثلاً عام درخت۔
ان میں زیتون کو سب پر مقدم رکھا۔ اولاً تو اس کے مبارک اور شہرہ یں

کی وجہ سے، ثانیاً اس کی بعض دوسری خصوصیات کی وجہ سے جن کا ذکر ہم آگے کریں گے اسکے بعد نخل اپنی کھجور کا ذکر فرمایا۔ یہ اہل عرب کے لئے اپنے اندر غذا اور لذت دونوں کا ذخیرہ رکھتی ہے۔ یہ ان کے لئے اناج بھی ہے اور انگور بھی۔ پھر اسی سلسلہ میں تمام پھل والے بڑی قسم کے درختوں کا ذکر کر کے اس دوسری نوع کی چیزوں کا بیان ختم کر دیا۔

جس ترتیب کے ساتھ ان چیزوں کا بیان قرآن مجید میں آیا ہے۔ بالکل اسی ترتیب کے ساتھ تورات میں بھی آیا ہے۔ اس میں بھی زمین کی اہم پیداواروں کا جان ذکر ہوا ہے، اناج، انگور، زیتون کا بیان بترتیب ملتا ہے۔ (دیکھو تنزیہ باب ۲۴: ۱۹-۲۱ و باب ۲۸: ۳۸-۴۰) البتہ کھجور کا ذکر چھوڑ دیا ہے اس لئے کہ شام کھجور کی پیداوار کے لئے کوئی اچھی جگہ نہیں ہے۔ یہ عرب کی مخصوص چیز ہے۔ بلکہ کہنا چاہئے کہ ان کے ملک کی اصلی پیداوار یہی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جگہ جگہ اس کا ذکر اناج کے ساتھ ملتا ہے۔ مثلاً فرمایا: فی جنت و عیون و زروع و نخل طلعھا ہضیم۔ دوسری جگہ فرمایا: و نزلنا من السماء ماء مبارکاً فانبتنا بہ جنت و حباً الحصيدا و انزلنا من السماء ماء مبارکاً فانبتنا بہ جنت و حباً الحصيدا۔ ایک جگہ فرمایا: و جنت من

اعتاب وزرع وخیل۔

غرض ان دونوں میں وہ تمام چیزیں سمٹ گئی ہیں جن کو انسان ہوتا اور لگاتا ہے۔ اس کے بعد ایک تیسری جامع نوع کا بیان کیا جس کے دو لفظوں میں زمین کی تمام باقی نباتات آگئیں یعنی فاکہ اور آب۔ ان میں سے ایک انسان کے لئے ہے، دوسری چوپایوں کے لئے ہے، چنانچہ اس کی تصریح بھی فرمادی۔ متاع الکمر وکلائعہ مکمر۔ تمھارے اور تمھارے چوپایوں کے برتنے کے لئے۔ یہ ایک مخصوص اسلوب ہے جو کسی سلسلہ کے زیر بطور استدراک اس لئے نمایاں ہوتا ہے کہ اس سلسلہ کی بقیہ تمام چیزوں کو سمیٹ کر کیل کی مہر لگا دے۔ قرآن مجید میں اس جامع اسلوب کی مثالیں بہت ملتی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا **ما تبصرون و ما لا تبصرون**۔ ایک جگہ بہت سے انبیاء کا نام ذکر کرنے کے بعد فرمایا۔ **ورسلنا قد قصصناہم علیک** بہت سے انبیاء ہیں جن کے حالات ہم نے تم کو سنا دیئے اور بہت سے ایسے ہیں جن کے حالات ہم نے تم کو نہیں سنا دیئے۔ اسی طرح بہت سے بارش جانوروں مثلاً گھوڑے، بچر، اور گدھے وغیرہ کے ذکر کے بعد فرمایا **و یخلفی ما لا تعلمون** اور بہت سی ایسی چیزیں پیدا کرتا ہے جن کو تم نہیں جانتے۔

آیات کا تعلق آگے اور پیچھے

اس تذکیر کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم کو اور ہمارے چار پایوں کو جو روزی مل رہی ہے، وہ اللہ تعالیٰ ہی کی بخشی ہوئی ہے۔ پس ہمارا تمام تر انحصار اسی کی ذات پر چرہ دی ہے جس نے حیوانات کو ہمارا محکوم اور خدمت کا بند دیا ہے اور جس طرح ہم خدا کے بخشے ہوئے رزق سے پلتے ہیں، اسی طرح وہ بھی خدا کے خزانہ جو دے روزی پاتے ہیں۔ پس یہ کسی بد بختی اور شقاوت کی بات ہے کہ ان انعامات و افضال کے باوجود ہم اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے سرتابی کریں۔

اس تعلیم کی نظیر پچھلی سورہ میں گزری ہے۔ اس لئے یہاں ہم اسکا صرف اتنا احصہ بیان کرنا چاہتے ہیں جس سے ان آیات کا تعلق آگے اور پیچھے سے واضح ہو جائے۔ تمام تفصیلات کو دوبارہ دہرانا غیر ضروری ہے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں ٹکڑوں میں ایک بات بطور قدر مشترک کے موجود ہے۔ یعنی ان میں انسان کی بے پروائی اور اسکے مقررہ اس کو سرزنش کی گئی ہے لیکن دونوں میں سرزنش کے پہلو کسی

کسی قدر خلقت ہو گئے ہیں۔ پہلے کھڑے ہیں انسان کے کفر و انکار پر سزا دینا ہے۔ اور اس دوسرے کھڑے ہیں اس کی نافرمانی اور ناشکری کا پلو پیش نظر ہے اور ساتھ ہی ان میں اللہ تعالیٰ کی پروردگاری اور قیامت کے دن اٹھائے جانے کی ایسی دلیلیں بھی چھپی ہوئی ہیں جن سے ایمان بالآخر کی طرف رہبری ہوتی ہے۔

علاوہ بریں ایکسا اور بھی پہلو پیش نظر رکھے۔ ان آیات میں آسان و محیشت کے جن سامانوں اور نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے، ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ دنیا بابت زندگی کی ایک نہایت جامع مثل جو اس قدر کو سمجھنے کے لئے ذیل کی آیت پر مدبر کرنا چاہئے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا بَخِيتُمْ	اے لوگو! تمھاری سرکشی کا وبال
عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ مَتَاعَ	تمھاری ہی چیزیں پر دنیا
الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ثُمَّ إِلَيْنَا	کی چند روزہ زندگی کے لئے اڑاؤ
مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ كَلَّا تَعْمَلُونَ	پھر ہماری طرف تم کو لوٹنا ہے اور ہم تم کو خبر دیں گے ان چیزوں کی جو تم کرتے
الدُّنْيَا كَمَا أَتْرَكْنَاهُ	رہے ہو۔ دنیا کی زندگی کی مثال تو

مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهِ
 نَبَاتُ الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ
 النَّاسُ وَالْأَنْعَامُ حَتَّىٰ
 إِذَا أَخَذَتِ الْأَرْضُ
 زُخْرُفَهَا وَازِيدَتْ وَنَخْلًا
 أَهْلَهَا أَتَاهُمْ قَادِرُونَ
 عَلَيْهَا أَتَاهَا أَمْرُنَا لَيْلًا
 أَوْ نَهَارًا فُجِعَ لَهَا حَدِيدًا
 كَأَن لَّمْ تَغْنِ بِالْأَمْسِ
 كَذَلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ
 لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ

ہیں ایسی ہے کہ ہر طرح پانی کہ جس کو
 ہم نے برمایا آسمان سے پس زمین کی
 نباتات جن کو آدمی اور چار پائے کھاتے
 ہیں اس سے بچیں۔ یہاں تک کہ جب زمین
 دنیا سنکا کر کرے اور وہ خوشنما ہو گئی ادا
 مالکوں نے سمجھا کہ وہ ابن س پر قادر ہیں
 آیا ہمارا حکم اس پر رات کے وقت یا دن کے
 وقت پس ہم نے اس طرح اس کا سنہرا
 کر دیا گویا کل وہ کچھ بھی ہی نہیں۔ ایسی
 ہی ہم اپنی آیتوں کی تفصیل کرتے ہیں سو
 والوں کے لئے۔

چنانچہ اس مقام کی اسی پوشیدہ حقیقت کے اقتضائے اس کے بعد قیامت
 اور روز جزا کا بیان شروع ہو گیا۔

ان آیات کے مطالعہ سے یہ امر بھی واضح ہو گیا کہ قرآن مجید میں جو آیتیں
 ترغیب و ترہیب کے لئے آتی ہیں۔ ان میں بھی استدلال کا زور پوری طرح موجود

ہوتا ہے۔ اور یہ قرآن کا نہایت عام اسلوب ہے۔

اس کے بعد فرمایا۔

فَإِذَا جَاءَتْ الصَّاحَّةُ (۳۳) يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ (۳۴)
وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ (۳۵) وَصَدَاحَتِهِ وَبَنِيهِ (۳۶) لِكُلِّ امْرِئٍ
مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ (۳۷) وَوُجُوهٌُ يَوْمَئِذٍ مُّشْفَعَةٌ (۳۸)
صَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ (۳۹) وَوُجُوهٌُ يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ (۴۰)
تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ (۴۱) أُولَئِكَ هُمُ الرَّاكِبُونَ (۴۲)

پھر جب وہ سخت آواز اُٹے گی (۳۳) جس دن آدمی اپنے بھائی سے بھاگے
گا (۳۴) اور اپنے ماں باپ (۳۵) اور اپنی بیوی اور بیٹے سے (۳۶) اس
روز ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی ہوگی (۳۷) بہت سے چہرے اس روز
روشن ہوں گے (۳۸) ہنستے اور خوش ہوتے (۳۹) اور بہت سے
چہروں پر اس روز خاک اڑتی ہوگی (۴۰) یہی ہوں گے کافر اور
بدکار لوگ (۴۱)

۱۳۔ الفاظ اوجہوں کی تاویل

ازایت ۳۳ تا ۴۲

[الصّٰلٰخَہ] عربی میں ”صحنہ سمعہ“ کے معنی ہوں گے ”اصمہ“ یعنی
 اس کے کان بہرے کر دیئے۔ پس قیامت کے لئے صلحۃ بہری کر دیو
 آواز کا لفظ اس کی دو مخصوص حالتوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ ایک تو
 اس کی اس اولین سخت و شدید کڑک کی طرف جو کانوں کو بہرا کر دینے والی
 ہوگی۔ دوسرے اس کی اس ہولناکی کی طرف جو ہر شخص کو اس کے نفس کے
 سوا ہر چیز سے غافل کر دے گی۔ قیامت کی اس حالت کی تصویر بعض
 آیات میں کھینچی گئی ہے۔ یومئذ ہل کل مرصعۃ عما رصعت و تَضَعُ
 کل ذات حمل حملها و تریطئ اس سکارئ۔ اور غری زبان میں جب
 کسی بڑی مصیبت کی شدت بیان کرنا چاہیں گے تو کہیں گے کہ ”کایستادی
 ولیدھا“ ایسی سخت کہ مائیں اپنے بچوں کو بھول گئیں۔ پس صلحۃ کے
 لفظ میں قیامت کی یہ دونوں حالتیں بیان ہوئی ہیں۔ اور چونکہ یہ لفظ پہلے
 مفہوم میں بالکل واضح تھا اس لئے قرائن نے اس کی کوئی تفصیل نہیں
 کی۔ لیکن دوسرے مفہوم کی طرف بغیر کسی اشارہ کے بے تکلف دہرائیں

منتقل ہو سکتا تھا۔ اس لئے قرآن نے یوم یفر الموع الا یہ سے لیکر کمال مرئی
منہم یومئذ نشان یخنیہ تک اس کی تشریح کی۔

[یفر] یہ قیامت کی ہولناکی کے لئے ایک پرکنا یہ طریق تعبیر ہے۔
یہ دن ایسا ہوگا کہ ہر شخص کو صرف اپنی پڑی ہوگی۔ دوسروں کی حالت کی
طرف توجہ کرنے کے لئے اس کو فرصت نہ ملے گی۔ اس کے بعد کے جلو
میں سبکی پوری تشریح ہو گئی ہے۔

[مسفرة] یہ "سفراء الصبح" سے لیا گیا ہے۔ یعنی روشن، تابناک۔
سرت کی پہلی تابناکی جو اہل جنت کے چہروں پر نمایاں ہوگی۔ یہ لفظ اس کو
ظاہر کر رہا ہے۔ بعد کے الفاظ سے اس کی تشریح ہو گئی ہے۔

[صاحکة] یہ مسرت سے کنایہ ہے۔ چنانچہ بعد کے لفظ نے اس کو کھلایا
اہل ایمان کو امن و سلامتی اور قرب و وصال کی دولت پا کر جو بشت
ہوگی اس کو صفا کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

[مستبشرون] اس لفظ نے معاملہ کو ایک قدم اور آگے بڑھا دیا۔ اللہ
کی نعمتیں جو اہل جنت کے لئے تیار ہوں گی ان کو دیکھ کر جو بشت یقیناً
چہروں پر نمایاں ہوگی، یہ لفظ اس کو ظاہر کر رہا ہے۔

[علیہا غبرۃ] یہ مسفرۃ کا مقابل اور ذلت و غم سے کنایہ ہے
یہ کنایہ قرآن مجید میں دوسرے مقام پر موجود ہے ولا یرہق وجوہہم
قتل ولا ذلۃ۔ امر اقصیٰ نے بھی اس کنایہ کو استعمال کیا ہے۔

علیہ القتام سئى الظن والبال

[ترہمہا قترۃ] ان پر سیاہی چارہی ہوگی۔ یہ لفظ غبرۃ
سے زیادہ سخت ہے یعنی پہلے ان پر خاک اڑے گی۔ پھر سیاہی چھائیگی
علیہا غبرۃ ترہمہا قترۃ ٹھیک ٹھیک مسفرۃ ضاحکہ مستبشۃ
کا مقابل ہے۔ اس مقابل کی مثال دوسری جگہ بھی قرآن مجید میں موجود ہے
یوم تبيض وجوهاً وتسود وجوهاً۔

[الکفرة الفجرة] اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کے شکر، اسکی نعمتوں
کے ناشکر گزار، اس کے حکموں سے بغاوت کرنے والے۔ اس سے
اوپر انسان کے کفر و ناپاسی کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا تھا، ان دو
لفظوں کے اندر اسی تفصیل کو سمیٹ دیا ہے۔

ایک لطیف نکتہ

(۱۳)

قرآن مجید جن چیزوں کو بیان کرتا ہے ان کی باہمی ترتیب میں ایک خاص حکمت مدعی ہوتی ہے۔ ہم یہاں اسی طرح کے ایک حکیمانہ نکتہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

اس سورہ میں غور کرو گے تو یہ بات نظر آئے گی کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی صفات خیر و شر کو مقابلہ کے اصول پر ایک خاص ترتیب کے ساتھ بیان کیا ہے۔ صفات خیر میں تزکی، تدن کر اور خشیت کو بیان فرمایا ہے۔ اور صفات شر میں سے استغنا، کفر اور فجور کو۔ پہلے تزکی، تدن کر، خشیت کی تینوں حالتوں پر غور کرو۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اوپر سے نیچے اترنے والی ترتیب ملحوظ ہے۔ تزکی خشیت کی آخری منزل ہے، اس کو پہلے بیان فرمایا ہے اور خشیت کو جو اس راہ کا نقطہ آغاز ہے سب سے آخر میں لائے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل ایمان و تقویٰ کا سفر ایک متعین منزل مقصود کی طرف ہوتا ہے، اس لئے سفر کے آغاز ہی میں منزل مقصود ان کے لئے ہوتی ہے۔ وہ نگر اٹھائے

سے پہلے ساحل کی سمت ٹھہرا لیتے ہیں۔ پس ضروری ہو کہ قرآن مجید بیان میں ایسی ترتیب اختیار فرمائے جو اہل ایمان و تقویٰ کی اس ذہنی حالت کو بے نقاب کر دے۔

برعکس اس کے صفات شر کے بیان میں ترتیب بالکل دوسری ہے۔ اس میں نیچے سے اوپر چڑھنے والی ترتیب ہے۔ یعنی استغناء و شقاوت کا پہلا زینہ ہے۔ اس کو پہلے بیان کیا۔ اور فجور بالکل آخری حالت ہے اس کو سب سے آخر میں لائے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل کفر و فسق اپنی آخری منزل سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں۔ وہ نفس کے اشارہ سے قدم اٹھا دیتے ہیں اور کچھ نہیں جانتے کہ کہاں جا رہے ہیں۔ بالآخر آہستہ آہستہ اس قعر ہلاکت تک پہنچ جاتے ہیں جو ایسے لوگوں کے لئے مقدر ہے۔ یہ نکتہ محتاج کی وجہ سے دونوں ترتیبوں میں اختلاف ہوا۔ اب دونوں ترتیبوں کے تدریجی لزوم پر غور کرو۔ پہلے خشیت ہے اس لئے کہ یہ تمام فوز و فلاح کی اصل ہے۔ یہ آدمی کو تذکر پر لہارتی ہے اور تذکر پر تکر کی طرف رہبری کرتا ہے جو اصل مقصود ہے۔ دوسری میں استغناء سب سے مقدم ہے کیونکہ یہ تمام فساد کی جڑ ہے۔ یہ انکار حق پر آمادہ کرتا ہے اور انکار حق، فجر

کا دروازہ ہے۔

ہم نے جو ترتیب بیان کی ہے، اگر ہم چاہیں تو اس پر قرآن مجید سے بہت سی مثالیں پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن ہماری اس کتاب میں اسکے متوالہد ایک سے زیادہ مقامات میں گزر چکے ہیں۔ اہل نظر خود بخود اس پر پوری طرح مطمئن ہو جائیں گے۔

۱۵۔ پوری سورہ کے نظم پر ایک اجمالی نظر

پچھلے مباحث سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اس سورہ کے ابتدائی حصہ میں کافروں اور فاسقوں پر بڑی توفیق تشریع کی گئی ہے تاکہ ان کی غفلت کی نیند ٹوٹے اور وہ نکمیں کھولیں۔ یہ مضمون ابتدائی دس آیتوں میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کے بعد قرآن مجید کی عظمت و منزلت کا بیان شروع ہوتا ہے کہ وہ پاک اور بلند ہے۔ عورت والے فرشتوں کے ہاتھ میں ہے اللہ تعالیٰ نے محض اپنے بندوں پر فضل و احسان فرمانے کے لئے اس کو اتارا ہے پس وہی لوگ اس کے مستحق ہو سکتے ہیں جو اس کی تقدیریت پہچانتیں۔ ان ناقدروں اور منکروں کے لئے نینت گرا نما یہ نہیں ہے۔

یہ مضمون سولہویں آیت تک آتا ہے۔ اس کے بعد دو فقرے ہیں۔ ان میں
 اپنی نعمتوں اور قدرت کو اس طرح بیان فرمایا ہے کہ جس سے انسان کا صنف
 و فقرہ واضح ہوتا کہ اس کے کفر و نافرمانی کی شتاعت پوری طرح بے نقاب
 ہو جائے۔ پہلے فقرے میں ان نعمتوں کو بیان فرمایا ہے جو انسان اپنے نفس کے
 اندر پاتا ہے۔ یہ فقرہ بائیسویں آیت پر ختم ہوتا ہے۔ دوسرے فقرے میں نعمتیں
 بیان ہوئی ہیں جو اس دنیا میں انسان کو سر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں
 اور جن پر اس کی زندگی اور بقا کا دار مدار ہے۔ یہ فقرہ بیسویں آیت تک آتا ہے۔
 پہلے فقرہ کو قتل الانسان ما اکفركا سے شروع کیا اور دوسرے
 کو کلاما یقض ما امرکا سے ان دونوں کو ترتیب پیش نظر رکھو تو
 خلاصہ مطلب یہ نکلے گا کہ اس انسان کے کفر کا معاملہ کتنا عجیب ہے جس کا
 وجود خود اس کی بندگی، اس کے صنف و عجز، اس کے فقر و احتیاج
 اور پھر بعث و قیامت اور حساب و جزا پر سب بڑی حجت ہے اور اس کی
 ناسپاسی اور بد عملی کس قدر قابل ملامت ہے جس کے وجود اور زندگی کا
 یہ لفظ پیرا گراف کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے بصنف نے اس کے
 لئے جملہ کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی چند آیتوں کا مجموعہ۔ (مترجم)

ایک ایک ریشہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور نوازشوں سے پل رہا ہے اور وہ ان تمام باتوں کو اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھ رہا ہے پس کفر اور جھوٹ یعنی ناسپاسی اور انکار دونوں کا ذکر یہاں ایک ساتھ بالکل اس اصول کے مطابق ہو چکا جس اصول کے مطابق ایمان اور عمل صالح کا ذکر ایک ساتھ ہوتا ہے۔ یہ بالکل عقلی ترتیب ہے، کیونکہ اعمال سترتا سرعقاد اور اخلاق کے تابع ہیں۔ قرآن مجید نے اس اصول کی طرف جابجا اشارات کئے ہیں۔

أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ
بِالدِّينِ، فَذَلِكِ الَّذِي
يُدْعَىٰ إِلَيْنَا
بِالْذِّمِّ
بھلا دیکھو تو اس کو جو روز جزا کو
کو تھٹھاتا ہے۔ وہی ہے جو یتیم کو
دھکے دیتا ہے۔

یعنی یتیم کو دھکے دینے کی شقاوت اس میں اس لئے پیدا ہو گئی ہے کہ وہ جزا کے دن کا منکر ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ یتیم کے ساتھ یہ معاملہ نہ کرتا۔ قرآن مجید میں مختلف پیرایوں سے یہ اصول بار بار بیان ہوا ہے۔ اب ان دونوں فرقوں کے خلاصہ مفہوم کو پھر ایک مرتبہ سمجھ لو کہ انسان کا معاملہ عجیب ہے، وہ اپنے ظاہر و باطن کو خدا کی بے شمار نعمتوں سے گھرا ہوا پاتا ہے، پھر بھی نہایت بے پروائی کے ساتھ، اس بات کا منکر

کہ وہ ایک دن اپنے کاموں کی جواب دہی کے لئے اٹھایا جائے گا! یہ کفر و ناسپاسی کی ایک بالکل ہی انوکھی اور حیرت میں ڈال دینے والی حالت ہے! آخر وہ کس چیز کا منکر ہے؟ کیا اس کی ان بے شمار نعمتوں کا جس کی شہادت اس کے وجود کے دیشہ ریشہ کے اندر سے بول رہی ہے؟ کیا اس کی اس ^{صاف} میں ڈال دینے والی قدرت کا جس کے عجائب اس کائنات کا کوئی گوشہ خالی نہیں؟ پھر جب یہ دونوں باتیں موجود ہیں، اور ان میں کسی ایک سے بھی اس کو انکار نہیں۔ تو پھر اس کو بدلہ اور مکافات کے ایک ناگزیر اور اٹل دن سے کیوں انکار ہو! وہ تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ خدا کی نعمتوں اور قدرتوں کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ کیا وہ چاہتا ہے کہ وہ خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں سے پوری طرح فائدہ اٹھائے لیکن ذمہ داری اور مسئولیت کا کوئی بار نہ اٹھائے! اس کی بخششوں کے خزان کرم پر عیش کرے اور پھر اس کے حکموں کو پوری بے پرواہی کے ساتھ ٹھکرائے! یہ کفر و جحود کی کیسی عجیب شقاوت ہے جو بد بخت انسان نے اختیار کر لی ہے!!

انسان کی شقاوت کے یہ دونوں گوشے جو اب تک تمھیں بیان میں پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں، سورہ کے آخر میں اگر بالکل ایک نقطہ پر سمٹ گئے ہیں۔

فرمایا اولئذ هم الکفراۃ الفجراۃ۔

انسان کے موجودہ فقر و احتیاج اور اس کے اوپر اپنے افضال و معنات اور اپنی قدرت کو بیان کرنے کے بعد اس کے اس فقر و احتیاج کو بیان فرمایا جس سے وہ زندگی کے بعد دوچار ہوگا جبکہ موجودہ سروسامان معیشت کی تمام خوش عیشیاں، جو آج غفلت و مدہوشی کا باعث ہیں، ختم ہو چکی ہوں گی۔ چنانچہ یہ مضمون شروع ہوا اور یہ آیت ۷۳ تک آیا۔ اور جس طرح پہلے فقرہ میں بعثت کے ذکر کے ساتھ ایسی چیزیں بیان ہوئیں جو بعثت پر دلیل تھیں اسی طرح قیامت کے ذکر کے ساتھ ایسے امور کا بیان ہوا جو قیامت پر دلیل ہیں۔ چنانچہ انسان کی خلقت کے ذکر کے بعد جس طرح فرمایا فاذا انشاء انشرہ۔

اسی طرح اس کے زرق کے بیان کے بعد فرمایا فاذا اجاءت الصاخرة کیونکہ انسان جب اپنی خلقت کے معاملہ پر غور کرے گا تو اس پر حقیقت بھی طرح واضح ہو جائیگی کہ جو خدا اس کو پیدا کر سکتا ہے، وہ اس کو دوبارہ اٹھا بھی سکتا ہے۔ بیٹر جب وہ پھر بکے انعامات کے معاملہ پر غور کرے گا تو اس میں اس امر کا یقین تازہ ہوگا کہ اس کے سامنے مسؤولیت اور باز پرس کا بھی ایک دن آئے گا اور اسے اپنے موٹی اور پروردگار کے سامنے کھڑا ہونا پڑے گا۔ سورہ مرسلہ

میں اس اسلوب کی نہایت عمدہ مثال موجود ہے۔

کیا ہم نے تم کو ایک حقیقت پانی سے نہیں	اَلَمْ نَخْلُقْكُمْ مِنْ مَّاءٍ
بنایا؟ اور پھر اسے ایک آرام کی جگہ میں رکھا	مَّهِينٍ فَجَعَلْنَاهُ فُرْقَانًا
ایک مقرر زمانہ تک، ہم نے مقرر کیا، کیا خواہ	تَمَكِّينَ اِنِّیْ قَدَرٌ مَّا عَلُوْمٌ
ہم مقرر کرتے ہیں۔ آج منکروں کی خرابی ہے۔	فَقَدَرْنَا فَنِعْمَ الْقَادِرُوْنَ
(یعنی بعثت کے منکروں کی) کیا ہم نے زمین کو	وَلَّیْ یَوْمَئِذٍ لِلْمُكِدِّیْنَ
سیٹھنے والی نہیں بنایا؟ زندہ کوا اور مردہ کوا کو اس میں	اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا
گڑے ہوئے اوپنے پہاڑ بنائے اور تمہیں	اَحْیَاءَ وَاَمْوَاتًا وَجَعَلْنَا
خوشگوار پانی پلایا۔ آج منکروں کی خرابی ہے۔	فِیْهَا رَوَاسِیَ شَیْخِیْثٍ وَّ
(یعنی روز جزاء کے منکروں کی)	اَسْقٰیْنٰكُمْ مَّاءً فُرَاتًا وَّلَّیْ
	یَوْمَئِذٍ لِلْمُكِدِّیْنَ

دوسرے مقامات میں بھی اس کی نظیریں موجود ہیں۔

انسان کے فقر و احتیاج اور اس کے کفر و فجور اور استغناء کی شاعت بیان کرنے کے بعد دونوں فریق یعنی ارباب خست و تقویٰ اور اہل کفر و فجور کے مال اور انجام کے بیان پر سورہ کو ختم کیا اور انہی کے بیان پر سورہ شروع ہوئی

تھی۔ یہ مضمون آیت ۲۴ پر ختم ہوتا ہے جو سورہ کی آخری آیت ہے۔
 اب پوری سورہ پر غور کر کے دیکھو کہ چند آیتوں کے اندر انسان کی بے پڑائی
 اور کفر و انکار کی حالت اور اس کے ضعف و احتیاج کی بے بسی اور اللہ تعالیٰ
 کے افضال و عنایات کی داستان کس خوبی و بلاغت اور اعجاز کے ساتھ بیان
 ہو گئی ہے۔ اور کس طرح یہ امر واضح ہو رہا ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی تمام
 نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت ہے۔ اور اسلوب بیان ایسا اختیار فرمایا ہے
 جس سے خود بخود یہ مترشح ہو رہا ہے کہ ہمیں آنحضرت صلیم کو تنبیہ فرمائی گئی ہے۔
 کہ آپ ان بے پروا اشیاء کو چھوڑ کر صرف ان لوگوں کو اپنی تمام توجہ اور شفقت
 کا مرکز بنائیں جو اس نعمت غنیمی کے مستحق ہیں۔

هَذَا اخْرَاجَ تِسْرًا لِنَاذِرِكُمْ فِي هَذَا الْمَقَامِ وَالْحَمْدُ
 لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ عَلَى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَآلِهِ
 وَصَحْبِهِ أَجْمَعِينَ

سلسلہ دائرۃ حمید نمبر ۱۶

تفہیم سُوہِ مُرسَلات

ترجمہ

امین حسن صلاحی
مکتبہ القرآن پبلی
امین پبلی فی بی کتابیات فی لندن

تفسیر

سورہ مرسلہ

تالیف

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ

ترجمہ

بامین حسن صدیقی

دائرہ حیات مدرالاصلاح سرامیر اعظم گڑھ

قیمت

فہرست مضامین

صفحہ	نمبر شمار
۲	۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے اس کا تعلق۔
۴	۲۔ سورہ کے مواقع ترجیح کے متعلق ایک اصولی بحث۔
۸	۳۔ لفظوں کی تفسیر اور بعض جملوں کی تاویل۔
۱۵	۴۔ ہواؤں کی شہادت اور آیات کا نظم و موقع۔
۲۱	۵۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی تاویل۔
۲۴	۶۔ ان آیات کی تفسیر اور ان کا نظم اور معاد پر ان کی حجت
۳۳	۷۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی تاویل۔
۳۶	۸۔ ظل ذی ثلث شعب سے ایک لطیف نکتہ۔
۴۰	۹۔ ان آیات کے نظم اور مواقع ترجیح پر ایک مجموعی نظر۔
۴۳	۱۰۔ الفاظ کی تفسیر اور جملوں کی تاویل۔
۴۷	۱۱۔ آیات کی تاویل اور ان کا نظم۔

(باہتمام منشی محمود علی، مطبع اصلاح سرائیبر اعظم گڑھ میں چھپی)

الشرح الرحمن الرحيم

وَالْمُرْسَلَاتِ عُرْفَاهُ ۚ فَالْحَصِيفَةُ
عَصْفَاهُ ۚ وَالنَّشْلَاتِ نَفْسَاهُ ۚ
فَالْفُرْقَاتِ فُرْقَاهُ ۚ فَالْمُلْقِيَتِ
ذِكْرَاهُ ۚ عَذْرَاءِ اَوْ نَكْرَاهُ ۚ اِنَّمَا
تُوعَدُ اَوْ نَكْرَاهُ ۚ فَاِذَا الْجُومُ
طُمِسَتْ ۚ وَاِذَا السَّمَاءُ فُجِّتْ
وَاِذَا الْجِبَالُ سُفِّتْ ۚ وَاِذَا الرَّسْلُ
اُقْتِتْ ۚ لَا يَمِي يَوْمَ اُجْلِتْ ۚ لِيَوْمِ
الْفَضْلِ ۚ وَمَا اَدْرَاكَ مَا يَوْمُ
الْفَضْلِ ۚ وَيَلِي يَوْمَئِذٍ لِّلَّذِينَ بَلَّغُوا

تسمہ چھانٹنے کی کہ چھوڑ دیا جاتی ہیں، پھر خاک
اڑاتی ہیں اور پھیلاتی ہیں، پھر بھاڑتی ہیں۔
پھر یاد دلاتی ہیں، الزام اتارنے کو یاد
سنانے کو کہ جو تم سے وعدہ کیا ہو ضرور
ہوگا، جبکہ تار سے چھپ جائیں گے۔ اور
آسمان پھٹ جائے گا، اور پہاڑ اڑیں
اور رسولوں کے لئے وقت مقرر ہوگا
کس دن پر یہ ٹالے گئے ہیں، فیصلہ کے
دن پر اور فیصلہ کے دن کہ تو کیا سمجھا،
اس دن منکر مرگ کی خرابی ہے۔

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ اس کی تعلق

آخر قرآن کی سورتوں میں بیشتر ابتدائے دعوت کے بنیادی مسائل بیان
ہے یعنی قیامت، نبیت اور احسان کا چنانچہ اس سورہ کا عمود بھی یہی تین چیزیں
ہیں۔ اور یہی تین ابتدائی نقطے ہیں جو پھیل کر دین کے تمام عناصر کو اپنے دائرہ
میں لے لیتے ہیں۔ قیامت کا ذکر، ایمان بالقرآن کی اصل ہے، کیونکہ قرآن
کی پہلی صدا ہی یہی ہے کہ وہ عدل و حیزار اور ایک خوفناک دن کے ظہور کی
منادی ہے۔ نبیت نماز اور توحید کی اصل ہے۔ اور تیسری چیز یعنی احسان
الی الخلق، تمام قوانین و شرائع کی بنیاد ہے۔

یہ تمام باتیں قرآن مجید میں اپنے اپنے موقع سے، نہایت تفصیل و وضاحت کے ساتھ،
بیان ہوئی ہیں اور اس سورہ میں بھی حسب اقتضائے موقع مختلف اسلوبوں کا ذکر
آیا ہے اور موقع کے اختلاف کے ساتھ اسلوب کا اختلاف قرآن مجید کی ایک خاص
خصوصیت ہے جس سے اہل نظر واقف نہیں، قرآن مجید نے اپنی اس خصوصیت کی طرف
خود اشارہ کیا ہے: **وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ لِيَذَّكَّرُوا**
اسی اصول پر اس عام عمود کے مختلف حصے مختلف سورتوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

کسی میں کوئی پہلو نمایاں ہو رہے کسی میں کوئی اور اسی لحاظ سے طرز خطا بھی بدل بدل گیا ہر کبھی فکر و احساس کو بیدار کیا گیا ہے اور کہیں عقل اور دل کو دعوت دی گئی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ان سورتوں میں دلائل کے ساتھ ترغیب و ترہیب بھی حسبِ اقتضائے بلاغت مختلف شکلوں اور بحیثیوں میں نظر آتی ہے۔ اس معاملہ کو اچھی طرح سمجھنے کیلئے اس سورہ کو سابق سورہ کے ساتھ ملا کر پڑھو۔ سابق سورہ (سورہ دہر) میں معادِ قرآن، اور نماز کا ذکر ہوا تھا۔ غور سے دیکھو تو اس سورہ میں بھی ان چیزوں کا بیان ہوا ہے لیکن اسلوب بیان بدل گیا ہے۔ سابق سورہ میں جو پہلو مہمل رہ گئے تھے اس سورہ میں وہ پہلو تفصیل کی روشنی میں آشکار ہیں۔ سابق سورہ میں معاد پر جو استدلال تھا، چند لفظوں میں تھا، اس سورہ میں وہ بسط کے ساتھ ہے۔ سابق سورہ میں معاد کی تصویر کیلئے ترغیب کا پہلو زیادہ نمایاں کیا گیا تھا۔ اس سورہ میں زیادہ زور ترہیب کے پہلو پر ہے۔ اچھا انداز و بشیر دونوں کو ساتھ ساتھ اور مساوی رکھنے کیلئے ایسا کرنا اقتضائے بلاغت و مصلحت دعوت کے عین مطابق تھا۔ خدا کے انبیاء ایک ہی ساتھ بشیر و نذیر دونوں ہوتے ہیں۔ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا مُبَشِّرًا وَنَذِيرًا۔

یہ جہانی مشالیت ہیں۔ ان دونوں سورتوں پر اگر پورا پورا ملاحظہ کیا جائے تو ہم نے جن سورہ کا ذکر کیا ہے وہ اچھی طرح واضح ہو سکتے ہیں۔

۲۔ سورہ کے موقع ترجیع کے متعلق ایک اصولی بحث

یہ سورہ ترجیع والی سورتوں میں سے ہے۔ اس میں ذیل یَوْمَئِذٍ نُّكَدِّبُنَ کَافِرُوہ دس مرتبہ دہرایا گیا ہے۔ اس اسلوب کی خصوصیات پوری تفصیل کے ساتھ سورہ ترجمان میں بیان ہو چکی ہیں۔ یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف ایک خاص امر کی طرف یہاں اشارہ کرنا چاہتے ہیں وہ یہ کہ ترجیع کی خوبی کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے مواقع کے لحاظ سے با معنی اور پوری طرح موزوں ہو۔ اور جو بات اس اوپر بیان ہوئی ہے اس سے پورا لگاؤ رکھتی ہو۔ اس اعتبار سے ترجیع کیلئے ناگزیر ہے کہ وہ مختلف وجوہ کی جامع ہو تاکہ مختلف جملوں کے ساتھ مل سکے۔ چنانچہ یہ آیت یَوْمَئِذٍ نُّكَدِّبُنَ کَافِرُوہ (۱) اپنے اندر مختلف پہلو رکھتی ہے۔ اور اسی وجہ سے مختلف مواقع کیلئے ٹھیک ٹھیک موزوں ہو گئی ہے۔ اس کے اسلوب اور اس کے تین نغظوں میں کافی وسعت ہے۔ ذیل میں ہم اس کے بعض پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

(الف) اس کا اسلوب ایسا ہے کہ اس میں اشارہ اور خبر و فوہ ہونے کی صلاح اور فوہ کا احتمال دونوں کے ساتھ ملتا ہے۔ اس کا بیان ہو گا کہ ان مکررین کیلئے ہلاکت اور خرابی ثابت ہوگی۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ اَلَّذِينَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِی الدُّنْيَا مُتَوَلَّوۡنَ

پس ان کیلئے خرابی ہے اس چیز کے باعث

وَقِيلَ لَكُمْ مَوْتَٰی كَسِبْتُمْ ۚ
 جان ہاتھوں نے لکھا اور اس کے سبب و کنتے ہیں۔
 یا ان کے اس قول کا بیان مقصود ہے جو قیامت کے دن کہیں گے اور انکا
 یہ قول قرآن مجید میں مختلف جگہ نقل ہوا ہے۔ مثلاً قَالُوا یٰۤاٰیُوۤسَلٰنَا هٰذَا یَوْمٌ
 الدِّیْنِ۔ دوسری جگہ ہے قَالُوا یٰۤاٰیُوۤسَلٰنَا مَنۢ بَعَثَنَا مِنۢ مَّرْقَدِنَا۔

لفظ ویل کی بار بار تکرار میں بھی ایک خاص راز ہے۔ اگر اس سے اثبات
 ویل کا مفہوم سمجھا جائے تب تو اس تکرار کا یہ فائدہ ہو گا کہ اس اسباب ویل کی کثرت
 واضح ہوگی اور اگر یہ قیامت کے دن ان کے قول کی نقل ہی تو اس کے معنی یہ ہو
 کہ اس دن اس کے بہت سے مواقع پیش آئیں گے اور وہ ہر موقع پر اپنی خرابی
 کا تاہم کریں گے۔ بعض آیات اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً فرمایا:-

وَ اِذَا اُلْقُوۤا مِنْہَا مَكَانًا ضِیْقًا ۙ
 اور جب وہ ڈال دیئے جائیں گے اس کی کسی
 مُقَرَّنَیۡنَ دَعَاۤہُنَا لِیۡکُ ثُبُوۡرًا ۙ
 تنگ جگہ میں باندھ کر پکارینگے اس وقت
 لَا تَدْعُوۡا الْیَوْمَ ثُبُوۡرًا وَّ اَحَدًا ۙ
 ہلاکی کو آج ایک ہی ہلاکی کو نہ پکارو بہت
 وَ اَدْعُوۡا ثُبُوۡرًا کَثِیۡرًا ۙ
 سی ہلاکیوں کو پکارو۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس دن ہلاکت کے اسباب اور مواقع دونوں ہی بیشمار ہوں
 (ب) لفظ ویل خود ایک جامع لفظ ہے، وہ تمام چیزیں اس کے تحت میں

آگئیں جو خرابی کا سبب ہو سکتی ہیں۔ غم، حسرت، پریشانی، عذاب قیامت، ہر چیز پر یہ جاوی ہے بعض جگہ قرآن مجید میں اس چیز کی تصریح کرو یا قاتی ہو جو ویل کا سبب ہوگی۔ مثلاً وَبَلِّغْ لِلْكَافِرِينَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيدٍ اور خرابی ہے کافروں کیلئے عذاب سخت کے سبب۔ دوسری جگہ ہے قَوْلُ لَّهُمْ مِمَّا كُتِبَتْ لَهُمْ وَبَلِّغْ لَّهُمْ مِمَّا كُتِبَتْ لَهُمْ اس چیز کے باعث جو ان کے ہاتھوں نے لکھا اور اس چیز کے سبب وکاتے ہیں۔ قَوْلُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ تَوْبِهِمُ الَّذِي يُوعَدُونَ۔ پس ہلاکی ہے کافروں کیلئے انکے اس دن کے سبب جن کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے۔

الفرض لفظ ویل کسی خاص آدمی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اوہ بیانات واضح ہو چکی ہے کہ چونکہ اس کے اسباب بہت سے ہوں گے، اس لئے اس کے مواقع بھی بہت سے آئیں گے۔

(ج) یَوْمَئِذٍ کا لفظ ان تمام چیزوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، اس کے معنی یہ ہوئے کہ جس دن ایسا ایسا ہوگا، پس اس کے حدود کی تعیین موقع کے لحاظ سے ہوگی۔

(د) مُكَذِّبِينَ کا لفظ ایک جامع لفظ ہے۔ اصلاً یہ نبی اور آیات تو حمید

کے انکار کیلئے آیا ہے، لیکن تفصیلات میں رسول اور کتاب اللہ کی تکذیب بھی اس میں داخل ہے۔ قرآن مجید نے جا بجا ان تمام پہلوؤں کی تصریح کر دی ہے۔ اور بعض آیات میں اس امر کو بھی واضح کر دیا ہے کہ جو اصل کا منکر ہو گا وہ لازماً اس کے فروع اور تفصیلات کا بھی منکر ہو گا۔ مثلاً فرمایا:-

وَإِذْ أَقْرَأْتَ الْقُرْآنَ جَدَلْنَا بَيْنَكِ
وَبَيْنَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ
حِجَابًا مَسْتُورًا وَجَعَلْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ
الْكِتَابَ أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا
وَإِذْ أذْكَرْتَ رَبَّنَا فِي الْقُرْآنِ وَحْدَكَ
وَلَوْ عَلَيَّ آدْبَارٌ مِنْهُمُ نُفُورًا
اور جب تم قرآن سناتے ہو تو ہم والدیتوں میں تھا
دریان اور ان کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں
رکھتے ایک ٹھنڈا پوڑا لٹیتے ہیں ان کے دلوں
پر غلاف کہ انکو نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں
بہاں پیدا کر دیتی ہیں اور جب تم قرآن میں اللہ
کو تنہا یاد کرتے ہو تو یہ نفرت کے ٹپچے بھاگتی ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ چونکہ وہ قیامت اور توحید کے منکر ہیں اس لئے لازماً اس چیز کا سنا بھی ان پر شاق ہے جو ان چیزوں کی طرف ان کو دعوت دیتی ہے۔ یہاں تا جہانی اشارہ کافی ہے۔ اپنے مقام پر پورے شرح و ربط کے ساتھ اسکی تفصیل موجود ہے۔ اس روشنی میں آیت ویل کا ظاہری اشارہ تو منکرین قیامت ہی کی طرف ہوگا لیکن سورہ کی آیات اس کے ایک پہلو تکذیب قرآن کی طرف بھی اشارہ کر رہی ہیں۔

اور حقیقت کے اعتبار سے ان دونوں میں صرف اجماع تفصیل کا فرق ہے۔
 تفصیل سے معلوم ہوا کہ آیت کی تریح کے متعدد پہلو ہیں۔ پس سیاق و سباق سے
 جو پہلو زیادہ لگتا ہوا ہوگا، اختیار کر لیا جائے گا۔ یہ اصولی بحث بطور مقدمہ ذہن
 نشین رکھنی چاہئے۔ ہم آگے موقع موقع کے اعتبار سے آیت کے مختلف پہلوؤں
 میں سے جو پہلو اقرب ہوگا اس کو بیان کر دیں گے۔

۳۔ لفظوں کی تفسیر بعض مملوین کی تاویل

(۱۵ - ۱)

[والموسىٰ است عرفاً] عربی میں ارسلا شئى اُمسكہ کا ضد ہے۔
 ارسلا شئى کے معنی ہوئے کسی بندھی ہوئی چیز کو چھوڑ دیا، آزاد کروا دیا۔ ہوار کی
 ہوئی ہے تو گویا بندھی ہوئی ہے، جب چلنے لگی تو گویا چھوڑ دی گئی، فرمایا،
 واسلنا الرباح لواقع

[عرفاً] انا حسیۃ النفس گھوڑے کی ایال کے وہ بال جو پیشانی پر
 لٹکے ہوتے ہیں۔ یہ ایک عام اور متداول لفظ ہے۔ امرؤ القیس کا شعر ہے۔
 فمش باعراف الجہاد الکفنا اذا نحن قمنا عن شواء مضہب
 جبہ کار کا کچی پکا گوشت کھا کر اٹھتے تھے تو گھوڑوں کی ایال میں اپنی ہاتھ پونچھ لیتے تھے۔

محض ارسال کا لفظ شدت کے اظہار کے لئے کافی نہ تھا، اس لئے
عاصفات کو اس پرف کے ذریعہ عطف کیا۔

[فَالْعَصِيفَةُ عَصْفًا] یعنی چلنے کے بعد سخت ہو جاتی ہے، ایسی ہوا عموماً نقصان کے لئے ہوتی ہے۔

حَتَّىٰ إِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلِ وَجَرْنَا
 بِهِم مَّرْجًا طَيِّبَةً وَفَرِحُوا بِجَاءِ
 رِيحٍ عَاصِفٍ وَجَاءَهُمْ
 الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ
 [وَالنَّشِيطَاتِ نَشْرًا]

یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں ہوتے ہو
 اور وہ انکو لیکر چلتی ہیں موافق ہوا کے تھرا اور وہ
 اس سے خوش ہوتے ہیں۔ چلتی ہے ان پر
 تند ہوا اور گھبر لیتی ہیں موجیں ہر طرف سے۔

براگتہ کر دینا، اور دنیا یہ سب معنی قریب قریب ہیں قرآن مجید میں یہ لفظ مختلف مواقع پر مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔ ایک جگہ ہے۔ **وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ**۔ دوسری جگہ ہے۔ **وَهُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَضَوْا أَوْنَهُمْ يَنْشَرُوا حَشَدَهُ** ایک جگہ فرمایا **وَجَعَلَ التَّهَارَاتِ تُنْشَرَاتٍ** یہاں ناشرات سے ہوا میں مراد ہیں۔ اسلئے کہ ان میں نشر کے مختلف پہلو آجاتے ہیں یہ بادلوں کو ابھارتی ہیں، پھر فضا میں پھیلاتی ہیں، پھر اُپر رب کی رحمت کو چھیٹتی ہیں، اور نباتات کو اگلا کر زمین کو سرسبز و شاداب بناتی رہتی ہیں اور چونکہ یہ متصل و صفت تھا، نصف سے متعاقب رہتا اسلئے حرف عطف واو آیا۔

[فَالْفَارِقَاتِ فَرَقًا] ہوا میں فرق و امتیاز کرتی ہیں۔ یعنی کہیں بارش کو لا کر لاتی ہیں، کہیں بادلوں کو اُگلا کر لیجاتی ہیں، کسی قوم کو نفع پہنچاتی ہیں، کسی کو ضرر۔ سورہ ذاریات میں ہواؤں کے ان تصرفات کو آیت **فَالْمُصِطَلَاتِ أَمْلًا** کے تحت میں ہم بیان کر آئے ہیں، چونکہ یہ فرق و امتیاز نشر کے بعد نمایاں ہوا ہے اس لئے عطف ف کے ذریعہ سے ہوا۔

[فَالْمُصِطَلَاتِ ذُكْرًا] قرآن مجید میں اکثر جگہ یہ بات بیان ہوئی ہے کہ ہواؤں کی تصریف میں اللہ تعالیٰ کی نشانی اور یاد دہانی ہے۔ اسی سمیت کھے تعلق کی وجہ سے، عام قاعدہ کے مطابق فعل کی نسبت ہواؤں کی طرف کر دی۔

جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعائیں اضلال کی نسبت اصنام کی طرف کر دی گئی ہے۔

وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ
اور تجھکو اور میری اولاد کو اس بچا کہ ہم بت
پر جنے لگیں، میرے پروردگار ان بتوں نے لوگوں
میں سے ایک خلق کثیر کو گمراہ کر رکھا ہے۔
النَّاسِ

پس ہواؤں کی تصریف کے بعد اس امر کو یاد دلایا کہ ہوائیں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے قانون قصار بالحق کا اعلان کرتی ہیں۔

[عَنْ سَلَاؤُنْ سَلَا] یعنی یہ یاد دہانی جو ہواؤں کی تصریف کے

ذریعہ سے ہوتی ہے اس کا مقصد غافلوں پر تمام حجت اور ہوشیاروں کو انداز کا پیام پہنچانا ہے۔ او تقسیم کیلئے ہے۔ قرآن مجید میں ایک جگہ مصلحین کا قول نقل ہوا ہے۔ اس میں اس مفہوم کی تصریح ہو گئی ہے۔

وَإِذْ قَالَتِ امَّةٌ مِّنْهُمْ لَمِ نَعْتُ
اور جبکہ کہا ان سے ایک گروہ نے تم کی نعمت
قَوْمًا ۖ اللَّهُ مُهْلِكُهُمْ أَوْ مُعَذِّبُهُمْ
کرتے ہو ایسے لوگوں کو جنکو اللہ ہلاک کرے یا
عَذَابًا شَدِيدًا ۖ قَالُوا مُعَذِّبُهُ
یا سخت عذاب دینے والا ہو۔ بولے تمہارے
إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَلَعَلَّكُمْ يَتَّقُونَ
رکے حضور میں معذرت کیلئے اور تاکہ وہ ڈریں

یعنی جو لوگ ہماری باتوں کو نہ مانیں گے ان کے حق میں ہماری طرف سے
 یہ معذرت ہوگی اور جو لوگ سنیں گے ان کو اس سے نفع پہنچے گا۔

[اِنَّمَا تُوْعَدُ وَنْ] یہ ایک عام لفظ ہے، قیامت، بعث، فیصلہ اور
 روز جزا، کے متعلق جو وعدے کئے گئے ہیں، وہ سب اس میں آگئے، قرآن مجید میں
 اس کی جو نظیریں ہیں ان میں جگہ جگہ ان تمام چیزوں کی تصریح کر دی گئی ہے۔
 اور چونکہ ان سب کی حقیقت ایک ہی ہے اس لئے یہاں اجمال کے ساتھ انکو
 ذکر کر دیا، تفصیل نہیں فرمائی۔

ت
 [طِيسَتْ] طيس الشيء کے معنی ہیں کسی چیز کو مٹا دیا اس کے تمام نشا
 و آثار محو کر دیئے مثلاً فرمایا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَطِيْسَ وُجُوْهَاً فَنُرْوِهَا عَنْكَ اَدْبَارُهَا۔
 [وَ اِذَا السَّمَاءُ فُرِجَتْ] اس کے نظائر متعدد ہیں۔ مثلاً وَفُتِحَتِ السَّمَاءُ
 فَكَانَتْ اَبْوَابًا۔ نیز وَ اِذَا السَّمَاءُ انْفَطَحَتْ۔ اس کے معنی یہ ہوئے، وہ آسمان
 جو تمہیں بالکل ٹھوس اور سہاٹ نظر آتا ہے جس میں کوئی شکاف یا دروازہ نہیں
 دکھائی دیتا۔ (وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوجٍ) فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَى مِنْ فُطُورٍ
 باوجود اس مضبوطی اور استحکام کے تم دیکھو گے کہ خدا کے حکم سے اس میں شکاف پڑ گئے ہیں۔
 [وَ اِذَا الْجِبَالُ سُيِفَتْ] اُنسف کے معنی ہیں ریزہ ریزہ کر دینا منتشر کر دینا۔

میں دینا بھاری بنا، اسی کو مناد اس کہہ کو کہتے ہیں جو گہروں کو بھس سوا لگ کر دیتا ہے۔
 قرآن مجید میں یہ لفظ کئی جگہ آیا ہے۔ وَالْعِلُّ إِلَى الْهِمَّةِ الَّتِي ظَلَّتْ عَلَيْكَ
 عَاكِفًا لِّخَيْرٍ قَدْ تَدْرُكُ لَنَسْفَةٍ فِالْبَيْتِ نَسْفًا۔ دوسری جگہ پر وَيَسْأَلُونَكَ
 عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا۔

[اُقِدَّتْ] وقت کی تریل شدہ صورت ہے۔ جیسے وجہ سے اجوہ۔
 توقیت کہتی ہیں وقت متعین کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ انبیاء کیلئے وقت متعین
 کیا جائے گا۔ عربی میں یہ اسلوب بہت عام ہے۔ مثلاً بولیں گے۔ ابغنی خادما۔
 ارسلنی فرسًا اور مطلب یہ ہوگا کہ ابغنی خادما و ارسل الی فرسًا۔ پس
 آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ انبیاء کیلئے ماضی کا ایک وقت متعین کیا جائے گا،
 اور اس میں ان سے ان کی امت کے تعلق سوال کیا جائے گا اور ان کی
 شہادتوں کے مطابق فیصلہ ہوگا۔ یہاں مضمون محل صورت میں ہے۔ لیکن
 دوسری آیت میں اس کی پوری تصریح ہو گئی ہے۔

[اُجِّلَتْ] اجل لہ۔ اس کے لئے ایک مدت ٹھہرا دی، ایک وقت
 متعین کر دیا۔ فرمایا۔ وَبَلَّغْنَا أَجَلَنَا الَّذِي أَجَّلْتُ لَنَا دَامَ اس مدت کو پہنچ گئے
 جو تو نے ہمارے لئے ٹھہرا دی تھی۔ اس کے اسلوب کے باب میں دو تا ویس

نہیں۔ یا تو تو آویل اختیار کر لیجئے جو وقت کے متعلق اپر گزری چکی ہو یا اجلت
الآجال کے سنی میں لیے سنجو۔ دونوں صورتوں میں مفہوم کے اعتبار سے کوئی فرق نہ ہوگا
[دوا اور ادراک] یعنی وہ دن عظیم اٹان ہوگا۔ یہ اسلوب استفہام کہی کہی محض تخنیم
کے لئے آتا ہے اور اس صورت میں جواب سے متنفی ہوتا ہے۔ مثلاً الْحَاقَّةُ مَا الْحَاقَّةُ

وَمَا أَذْرَاكُمَا الْحَاقَّةُ۔ كَذَبَتْ ثَمُودُ وَعَادٌ بِالْقَارِعَةِ
[وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ] اس آیت کے مختلف پہلوؤں کا ذکر اوپر ہو چکا

ہے۔ یہاں صرف مناسب مقام اس کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ٹکڑا وَادَا
الْجَوْنُ مَرُّ طَيْسَتْ الْآيَةِ کا جواب نہیں ہے۔ اس کے متعدد وجوہ ہیں۔

۱۔ اس کے جس قدر نظائر ہیں ان میں منوی تعلق کے باوجود

اس کی حیثیت بالکل مستقل ہے۔

۲۔ اس طرح کی شرط کے موقع پر جواب پُر ف آتی ہے۔ الا انکم جواب جملہ فعلیہ

یا ظرفیہ ہو مثلاً فَاذْنَبْتَنِي النَّارُ فَنَذَرُكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمَ تَحْشُرُ۔ دوسری جگہ ہے۔ يَوْمَ
تَوَدُّ السَّمَاءُ مَوَدًّا وَتَسِيرُ الْجِبَالُ سَيْرًا فَوَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ۔

۳۔ اس قسم کی شرط میں جواب مذکور ہوتا ہے مثلاً اِذَا السَّمَاءُ انشَقَّتْ وَ
اِذْنَتْ لِرَبِّهَا وَحُفَّتْ وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ وَاَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ۔

وَأَذِّنْ لِرَبِّهَا وَحَقَّتْ، يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ إِنَّا فَكَّرْنَا بِكَ كَادِحًا ۝ الْآيَةُ اس میں جواب
مذہب ہے، اس لئے کہ سیاق کلام سے خود واضح ہے۔

۴۔ ہواؤں کی شہادتِ آیات کا نظم و موقع

ہم اپنے رسالہ ”الامعان فی اقسام القرآن“ میں بیان کر چکے ہیں کہ زمین پر
پرویل شہادت ہیں پس یہاں بھی ان ہواؤں کا ذکر اسی مقصد سے ہوا ہے۔
اور یہی وجہ ہے کہ بیان میں ان کے مختلف پہلوؤں کا ذکر کئے گئے ہیں۔ وہ چھوڑ
دیجاتی ہیں، تیز و تند ہو جاتی ہیں، بادلوں کو لا کر لاتی ہیں، نباتات کو اگاتی ہیں
حیوانات کی پرورش کا سامان کرتی ہیں، پھر ہر سرزمین کے ساتھ ان کا معاملہ
یکساں نہیں ہوتا۔ اس میں فرق و اختلاف ہوتا ہے۔ کہیں پانی برساتی ہیں۔
تو کہیں خشک و بخر چھوڑ جاتی ہیں، ایک قوم کو اپنی زرخیز یوں اور شادابیوں
کی دولت سے مالا مال کر دیتی ہیں۔ دوسری کو اپنے اولوں اور بگولوں اور
کرک اور دمک کی آفتوں سے تباہ کر دیتی ہیں۔

یہ سب حالتیں اور خصوصیتیں اس لئے بیان کی گئی ہیں کہ واضح ہو کہ ان
کی باگ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اسکی قدرت و حکمت ان پر پورا تصرف کرتی ہے۔

وہ اپنی عام حالت میں خدا کی رحمت کیلئے پیام بشارت ہیں لیکن جب وہ چاہتا ہے، ان کے ذریعہ سے ایک ظالم قوم کو ہلاک برباد کر دیتا ہے اور دوسری مظلوم لیکن صالح قوم کو ساحل نجات تک پہنچا دیتا ہے، کبھی ان کی باگیں ڈھیلی کر دیتا ہے اور کبھی کھینچ لیتا ہے، یہ تمام باتیں سورہ ذاریات کی تفسیر میں ہم بیان کر آئے ہیں۔ اور قرآن مجید نے متعدد مواقع پر اس قدر توضیح و تفصیل کے ساتھ ان کو دہرایا ہے کہ یہاں دلائل کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔

انہی ظاہری احوال و آثار پر قرآن نے ایک عظیم الشان حقیقت کی بنیاد رکھ دی ہے، یعنی دنیا میں ہواؤں کے جو تصرفات ہم دیکھتے ہیں ان سوجست، عذاب، بخشش و انعام اور نفع و نقصان کے جو مظاہر ہمارے مشاہدہ میں آتے ہیں ان ہی سے ایک روز جزا کے وقوع پر دلیل قائم کی ہے، کیونکہ قانون جزا و جزا کی اتنی نشانیاں اور دلیلیں ان کے اندر نمایاں ہیں کہ کوئی شخص انکا انکار نہیں کر سکتا۔ یہ خدا کی پروردگاری، اس کی قدرت، اسکی حکمت اور اسکی تدبیر کی گواہی دیتی ہیں، اور واضح کرتی ہیں کہ وہ اپنے بندوں سے غافل نہیں ہے، بلکہ اس کے انعام کی بخششیں اور اس کے عذاب کے تازیانے اُسے دن ان کے لئے نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ پس جب یہ سب کچھ دنیا میں ہو رہا ہے ہم اپنی آنکھوں

سے یہ عجائب روز دیکھ رہے ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے ایک ایسا دن نہ آئے جیسے ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق بدلے۔

یہ جزار و سزار کے وقوع پر بنیادی دلیل ہے اور پوری طرح کفایت کرتی ہے۔ لیکن معاملہ کی ایک خاص حالت اس سے کچھ زیادہ کی متقاضی ہوئی۔ کفار اپنی شدت غفلت کے باعث روز جزار کے دو وجہوں سے منکر تھے۔ ایک اس کے عجیب و غریب ہونے کی وجہ سے، دوسرے اس کی تاخیر کی وجہ سے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم بہت دنوں سے اس کی آمد کی دھمکیاں سن رہے ہیں لیکن وہ آتی نہیں۔ پس موقع متقاضی ہوا کہ کلام کا اسلوب ایسا ہو کہ ان دونوں شبہات کا آپسے آپ جواب نکل آئے۔

چنانچہ پہلے شبہ کو یہاں یوں دور کیا کہ روز قیامت کی جو تفصیلات بیان فرمائیں وہ تمام ایسی ہیں جو ہواؤں سے فعل سے مشابہت رکھتی ہیں۔ مثلاً ہوائیں نشانات کو مٹا دیتی ہیں، آٹار کو دبادیتی ہیں، بادلوں کو اڑا دیتی ہیں اور بسا اوقات تیز ہو جاتی ہیں تو ان کے زور سے دیواریں ڈھ جاتی ہیں جھتیں اڑ جاتی ہیں عایشا عمارتیں پارہ پارہ ہو جاتی ہیں۔ ہر ہمارے آئے دن کے مشاہدات ہیں، لیکن ابھی ان کو دیکھنے کے لئے ہمارے آنکھیں نہیں کھلی ہیں۔ قرآن مجید نے

ان کی طرف اسی مقصد سے اشارہ کیا ہے کہ جو شخص ان کو سمجھ جائے گا وہ ایک ایسے دن کے ظہور کے متعلق شبہ میں نہیں رہ سکتا جس دن سارے چھپ جائیں گے آسمان کھل جائیں گے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے کیونکہ ہواؤں کے عجائب تصرفات میں ان کی نشانیاں موجود ہیں اور پوری طرح واضح۔

دوسرا شبہ ایک عام شبہ تھا، اسی لئے قرآن مجید نے اس کا مختلف مواقع پر مختلف پیرایہ میں جواب دیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا
مَا تَرِيعَ عَلَى ظَهْرِهِمْ هَٰمِنٌ دَابَّخِي
وَلَكِنْ يُؤَخِّرُهُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَإِذَا
جَاءَ أَجَلُهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِعِبَادِهِ
بَصِيرًا

اگر اللہ روزِ قیامت کو لوگوں کی برائیوں پر فوراً توروں میں
ہر ایک جاندار کو بھی نہ چھوڑتا لیکن وہ ان کو ملت
دیتا ہے ایک مقررہ مدت تک پس جب ان کی
مدت پوری ہو جائے گی تو بیشک اللہ اپنے
بندوں کا نگرانِ حال ہے۔

یہاں اس سے کسی قدر مختلف پہلو اختیار فرمایا ہے۔ یہاں فرمایا ہے کہ وہ روزِ جزاء، یَوْمَ الْفَصْلِ دو ٹوک فیصلہ کا دن ہو گا۔ پس رجعت الٰہی متعنی ہوئی کہ لوگوں کو ملت بخشے اور نصیحت و عبرت کے زیادہ سے زیادہ مواقع ان کے کاموں تک پہنچا دے تاکہ جو غافل اور بے پروا ہیں ان پر رجعت تمام ہو جائے اور جن کے

دلوں میں نصیحتوں کے سننے اور قبول کرنے کی کچھ صلاحیت ہے وہ اپنے لہجہ نجات
 کی راہ ڈھونڈ لیں کیونکہ جب وہ دونوں فیصلہ کا دن آجائے گا تو پہلوئوں کے درمیان
 بند ہو جائیں گے پھر نہ تو غافلوں کے لئے توبہ کی فرصت باقی رہے گی اور نہ ان کا کوئی
 عذر مسموع ہوگا اور نہ ان کے پاس کوئی تدبیر یہی ایسی ہوگی جس سے وہ خدا کے انتقام
 کی سخت پکڑ اور اس کی عداوت کا ملہ کے فیصلہ سے اپنے کو بچا سکیں۔ چنانچہ اس حقیقت
 کو پوری طرح واضح کرنے کے لئے پہلے اس **یَوْمَ الْفَصْلِ** کی عظمت و اہمیت کو بیان
 فرمایا۔ اس کے بعد ان لوگوں کی حماقت کو آشکارا کیا جو اس دن کی آمد کے منکر ہیں۔
 کیونکہ وہ ایک ایسے دن کے منکر ہیں جو اٹل ہے۔ اگرچہ اس کے ظہور میں دیر ہو اس کے
 بعد پندرہویں آیت **وَلَّیْ یَوْمَئِذٍ لِّلْمُکْذِبِیْنَ** ہے۔ خود کہہ کر **یَوْمَ الْفَصْلِ** اور
یَوْمَ الْجُزْأِ کے ذکر کے بعد اس آیت کا انا کس قدر باموقع اور طبع اسلوب کلام
 ہے! ان دو جامع لفظوں کے اندر وہ سب کچھ بیان ہو گیا جو اس دن حکمرانوں کے
 سامنے آئے گا اس کے بعد خرابی کے اسباب اور اس کے مختلف پہلوؤں کی تفصیل
 کر دی جو آگے دیکھو گے۔ اب ہر ترجمہ کے بعد اسی جامع مفہوم میں سے کوئی مناسب
 مقام چھو نودا رہا ہو جائے گا۔

یہاں تک حضرت کے عام احوال و معاملات سے متعلق لال تھا اس کچھ

کلام نے دوسری روش اختیار کر لی یعنی گزری ہوئے واقعات ثابت وقائم آثار
اور آزمائی ہوئی سنت اللہ سے شہادت پیش کی ہے، اور یہ قرآن مجید کا ایک معروف
انداز ہے۔ فرمایا۔

الْمُهَلِّلِ الْأَوَّلِينَ ۝ ثُمَّ نَسِيعُهُم
الْآخِرِينَ ۝ ذَٰلِكَ لَا تَفْعَلُ بِالْخَافِينَ ۝
وَلِیُّ یَوْمَئِذٍ الْمُلْکِ ۝ بَیْنَ ۝ ۱۱ ۝
نَخْلَقُکُمْ مِّنْ مَّاءٍ مَّهِینٍ ۝ فَجَعَلْنَاهُ
فِی قَرَارٍ مَّکِینٍ ۝ ۱۲ ۝ اِلَیَّ قَدْ رَمَعُوْهُ ۝
فَقَدْ ثَرَانَا فَنِعْمَ الْفَعِلُ ۝ ۱۳ ۝
وَلِیُّ یَوْمَئِذٍ الْمُلْکِ ۝ بَیْنَ ۝ ۱۴ ۝
تَجْعَلِ الْاَرْضَ کِفَاۤتًا ۝ ۱۵ ۝ اَحْیَاءَ
وَاَمَوَاتًا ۝ وَجَعَلْنَا فِیْهَا رَاسِیَ
شَمِیْتٍ ۝ وَاسْقٰیْنَاکُمْ مَّاءً فُرَاتًا ۝
وَلِیُّ یَوْمَئِذٍ الْمُلْکِ ۝ بَیْنَ ۝ ۱۶ ۝

کہوں ہم نے مٹا دیا انگوں کو، پھر ان کے سچے
پھلوں کو بھی، گنہگاروں کے ساتھ ہم یونہی کیا کرتے ہیں
اس دن منکروں کی خرابی ہے۔ کیا ہم نے نصیں
ایک بے حقیقت پانی سے نہیں بنایا، پھر اسے
ایک ہم کی جگہ میں رکھا، ایک مقرر زمانہ تک ہم نے
مقرر کیا، کیا خوب ہم مقرر کرتے ہیں۔ اس دن
منکروں کی خرابی ہے۔ کیا ہم نے زمین کو
سیٹنے والی نہیں بنایا، زندہ اور مردہ کو۔ اور
اس میں گڑے ہوئے اونچے پہاڑ بنائے
اور خوشگوار پانی پلایا۔ اس دن منکروں
کی خرابی ہے۔

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی تاویل

[مَہِیْن] مَہِیْنۃ کے معنی ہیں عدم اہتمام کے یہیں سے ابتداء اور
تجھیر کا مفہوم پیدا ہو گیا۔ امتہنت الشی کے معنی ہوئے، تم نے اس کو حقیر و متنبذ
خیال کیا۔ اسی سے ماہن ہے جس کے معنی نوکر اور غلام کے ہیں۔ مہنۃ کے
معنی خدمت کے ہیں۔ مہنہ اس کی خدمت کی۔ قرآن مجید میں ہے۔ وَلَا
تَطْعُ كُلَّ جَلَدٍ مَّہِیْن۔ ہر لہٹے ذلیل کی بات نہ سنو۔ مَہِیْن یعنی متبذل۔
ایک دفعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرعون کا قول نقل ہوا ہے۔ ادا سنا
خیون هذا الذی ہو مہین ولا یکاد یبین۔

[قَرَأَ] قَرَأَ کے معنی سکون اور جائے سکون دونوں کے آتے ہیں۔
قرآن مجید نے اس کو دونوں معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا ہے۔
وَأَن لَّا تَخْرُجَہِی دَارَ الْقَرَأِ سِیْئَیْ خَرَجَہِی سِکُونِ کَاغْرَہِی۔ دوسری جگہ
فَوَلِّیْہِیْ اَمِّنْ جَعَلَ قَرَآءَیْہَا قَرَآءَ کَالنَّطْرِ مَوْضِعَ قَرَآءَ کے معنی میں استعمال
ہوئے۔ ایک جگہ فرمایا ہے یَصْلُوْہَا وَیَسْأَلُ الْقَارِءَ۔ اس میں داخل ہوئے
اور وہ براٹھ کھاتا ہے۔ یہیں سے قَرَآءَ لفظ زین کے گوشہ ہوا اور مَہِیْن کے لئے بھی

استعمال ہوا۔ مثلاً فرمایا: **وَاَوَيْنَهُمَا إِلَى رُبُوعِ ذَاتِ قُرْأِ وَمَعِينٍ**۔

[مَلِكَيْنِ] مَلِکِیْنِ کے معنی ہیں مٹھن، کبھی یہ جگہ کی خست کے لئے آتا ہے۔

اس وقت معنی ہوتے ہیں: ایسی جگہ جو ہر طرح کے اضطراب و زلزل سے بالکل محفوظ ہو۔ اور کبھی فی ذی العقول کی تعریف کے لئے آتا ہے، اس وقت اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ایسا شخص جو مجرور اور اعماؤ کے لائق اور مرتبہ کے لحاظ سے مستحق

وہ سوخ ہو، قرآن مجید میں ہے **عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَلِكَيْنِ**۔ **مُطَاعٍ لِّمَا مَعَهُ** بادشاہ مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام سے کہا تھا: **إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَلِكٌ يَسْئَرُ**

[قَدْ سَرَا] **قَدْ سَرَا** الشی چیز کی مقدار اور اس کا اندازہ۔ **إِنَّا كُلُّ شَيْءٍ خَلْقْنَاهُ**

بِقَدَرٍ ہم نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے ایک اندازہ کے ساتھ۔ دوسری جگہ ہے: **وَأَنَّ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَ نَاخِرَاتِهِ وَمَا نُنَزِّلُ إِلَّا إِلَّا لَقَدْ مِّنْ مَّعْلُومٍ** نہیں ہر کوئی

چیز مگر ہمارے پاس اس کے خزانے موجود ہیں اور ہم اس کو نہیں اتارتے مگر ایک

متعین اندازہ کے ساتھ۔ سکون وال کے ساتھ بھی اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ **قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا**۔ دوسری جگہ ہے: **وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدْرًا مُّقَدَّرًا**

[معلوم] معلوم کے معنی ہیں متعین، شواہد اور گواہی کے ہیں۔ جو چیز

متعین نہیں ہے، ہم ہوگی، وہ معلوم نہیں ہو سکتی۔

[فَكَذَّبْنَا] یہ قدر سے ہے بمعنی تقدیر کے یعنی اندازہ ٹھہرنا، شواہد پورے گذر چکے ہیں اور قدرت سے بھی ہو سکتا ہے، اور یہ معنی بھی نہایت معروف ہیں۔ یہاں دونوں معنی لگ سکتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں اس کی ان دونوں صفتوں کی جلوہ گری ہے۔۔۔۔۔ قرآن مجید میں ان دونوں کے نظائر بھی موجود ہیں۔
 [اِذَا نَادَىٰ] کفترہ ضمہ و جمعہ جمع کر لیا۔ اکٹھا کر لیا۔ حدیث شریف میں ہے
 اَکْفَتُوا صَبِيحًا نَكَمًا بِاللَّيْلِ۔ رات میں اپنے بچوں کو اکٹھا کر لیا کرو۔ کفترہ عن
 وجہہ کے معنی ہیں کسی چیز کو اپنے پھرہ سے ہٹا دیا۔ اسی سے کفترہ چھوٹی ہانڈی
 کے معنی میں ہے۔ عربی میں فعال کا وزن اس چیز کے لئے بھی آتا ہے جس کے ذریعہ
 فعل انجام پذیر ہو۔ مثلاً نہ ماہوا اسی معنی کے اعتبار سے اس میں فاعل کی قوت
 پیدا ہو گئی ہے اور اس کے بعد مفعول کا استعمال جائز ہوا۔

[رَوَّاسِيٍّ شَمْعَةٍ] یعنی پہاڑ جن کی جڑیں زمین میں گڑی ہوئی اور چوٹیاں
 فضا میں بلند ہیں۔ صفت نے موصوف کو خود واضح کر دیا اس سے موصوف کا
 ذکر نہیں ہوا۔ عربی میں یہ اسلوب بہت عام ہے۔ اور قرآن مجید میں اس کی بہت
 مثالیں مل سکتی ہیں۔

[فَرَاتٍ] وہ اپنی جو نہایت شیریں ہو۔ قرآن مجید میں ہے وَهُوَ الَّذِي

مَوْجَ الْبَحْرِ هَذَا عَذَابٌ فُوتَ وَهَذَا مِثْلُ الْجَاذِبِ - دوسری جگہ ہے -
وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرَانِ هَذَا عَذَابٌ فُوتَ سَائِعٌ شَرَابُهُ وَهَذَا مِثْلُ الْجَاذِبِ
اسی وجہ سے کوفہ کی نذر کوفرات کہتے ہیں۔

ان آیات کی تفسیر ان کا نظم اور مجاہدان کی محبت

ان آیات میں تین فقرے اور تین ترجیحات ہیں۔ اور یہ تینوں ترجیحات تین
مستقل خطابات کے بعد بار بار نمودار ہوئی ہیں۔ اور ہر خطاب استفہام اقراری سے شروع
ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ تمام باتیں مخاطب کی جانی بوجھی ہوئی ہیں۔ پھر غور کرو
یہ تینوں خطابات تین مختلف پہلوؤں سے معاد پر دلیل پیش کرتے ہیں پہلے خطاب میں، زمین
کے آئندہ نشانات سے استدلال ہے، دوسرے فقرے میں انسان کی خلقت
اور جم کے اندر اس کی پرورش اور صورت گیری سے استشہاد ہے اور تیسرے
میں اس زمین کو رجم کی مثال قرار دیا گیا ہے۔ اور اس پہلو سے معاد پر اس سے
دلیل پیش کی گئی ہے۔

یہ پہلا خطاب ان واقعات کو یاد دلاتا ہے جن کے آثار مخاطب کے گرد و پیش
موجود ہیں۔ یعنی نافرمان قوموں کی ہلاکت و بربادی کے واقعات۔ پہلے عرب خوب

واقف تھے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض قوموں مثلاً ماوروم لوط کو ہولناک عذاب بھیج کر ہلاک کر دیا۔ یہاں چونکہ ہوا کے تصرفات کی شہادت موجود تھی اور مقصد وہ اس پاس کی گتہ بستیوں سے عبرت دلانا تھا اس لئے معاملہ بغیر تفصیل کے واضح تھا چنانچہ واقعات کا ذکر نہیں فرمایا۔ صرف اجمال کے ساتھ ان کی طرف اشارہ کر دیا۔ اَکْمَرُ كُنْهِدِ
اَلَا وَلَیِّنَ..... کَذٰلِکَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِیْنَ۔ لیکن دوسرے مقامات میں نہایت تفصیل کے ساتھ اس کو بیان کیا ہے۔

فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ
اَوْحٰی اَیْتَهُمْ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ
مُّطْمَئِنِّنًا بَلْ هُوَ اَسْتَعْجَلَمٌ
رَّجْرَجٌ فِیْهَا عَذَابٌ اَلِیْمٌ نُّدْمِرُ
کُلَّ شَیْءٍ یَّا مَرْیَءٍهَا فَاَصْبَحَ کَاکِبًا
اَلَا مَسٰکِنُهُمْ کَذٰلِکَ نَجْزِی
اَلْقَوْمَ الْمُجْرِمِیْنَ.....
وَلَقَدْ اَهْلٰکْنَا مَا حَکُمِیْنَ الْقُرٰی
وَحَمَلْنَا الْاٰیٰتِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ

پس جب انھوں نے اس کو دیکھا ابر کی شکل میں
برہنہ ہوا اپنی واحدیوں کی طرف، کہا یہ تو بے پرو
ہم پر برس کے ترسکا۔ نہیں بلکہ وہ وہ چیز جس
کیلئے تم جلدی پکار رہے تھے۔ تند ہو آجیں حد تک
عذاب ہے، اپنی جگہ گم سے ہر چیز کو تھس تھس کر دیں گے۔
پس وہ اس طرح ہلاک ہو گئے کہ ان گھروں کے لوگوں
چیز باقی نہیں رہی۔ ایسی ہی جلدی دیکھ کر گھمگھم کو۔
اور ہم نے تمہارے اس پاس کی بستیوں کو ہلاک کر دیا
اپنی آیتیں پھر پھر کر بیان کیں کہ وہ رجوع کریں۔

اب اس روشنی میں اگر اس خطاب کو سمجھا جائے تو اس کے معنی بالکل واضح ہوتا
 گئے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہم نے اگلے مجرموں اور شریوں کو ہلاک کر دیا۔ اور یہ ہماری ایک
 جاری و قاعہ و سنت ہے۔ یکے بعد دیگرے قوموں کی بربادی کے واقعات تم جانتے اور
 سنتے رہے ہو، پس آخرت کا منہ ابھی یونانی ہے جو گنہگار ہو گئے سزا پائیں گے، جو نیک
 ہوں گے وہ ہماری خوشنودی سے سرفراز ہوں گے۔ تفصیل ایک 'یَوْمَ الْفَصْلِ' کے
 واقعہ تک خود بخود بنتی ہو رہی تھی، اس لئے اس کے ذکر کی ضرورت نہ ہوئی، البتہ
 اس سے جولاہی نتیجہ پیدا ہوا تھا اس کا ذکر کر دیا وِیلِ یَوْمَئِذٍ لِّمَن كَانَ بِیْنَ
 اس دن منکروں کی خرابی ہے۔ تاکہ منکروں کو اس دن جن حالات سے دوچار ہونا
 ہے اس سے خبردار ہو جائیں۔ یہاں وِیلِ کے ایک نقطہ نے عذاب کی تمام اقسام
 کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ نیز آیت کے موقع سے یہ بات خود بخود نمایاں ہے کہ
 فیصلہ کے دن کا انکار ایک سخت ترین جرم ہے۔ یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے
 عدل اور اس کی قدرت و رحمت کا انکار ہے، پھر یہ ہر طرح کے شرک و محیثیت
 کا سرچشمہ اور اللہ تعالیٰ کی آیات، اس کے رسولوں پر ایمان لانے سے متکبرانہ
 ہے۔ یہاں یہ باتیں اشارات سے معلوم ہو رہی ہیں۔ دوسرے مقامات میں ان کی
 پوری تفصیل آگئی ہے۔

دوسرے خطاب نے نظم کے ایک خوبصورت پہلو کو نمایاں کیا ہے یعنی پہلے
میں آفاق کی شہادت پیش کی گئی تھی اور اس میں انفس کی شہادت پیش کی گئی ہے
اور ان دونوں کا اجتماع قرآن مجید کی بعض آیات میں بالکل نمایاں ہے مثلاً

وَفِي الْأَنْفُسِ آيَاتٌ لِّمَن يُّعِينُ ۖ
فِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ

اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین کرنا والوں کے لیے
اور تمہارے نفوس کے اندر بھی پس کیا تم کو نظر نہیں آتی

اس خطاب میں جن امور کا ذکر کیا ہے ان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ
جس پر وہ دگار نے تمہاری خلقت کی چھوٹی چھوٹی جزئیات کا اہتمام فرمایا، کیسے ہو سکتا
ہے کہ وہ تمہاری زندگی کے کلی امور سے جو بالکل بنیادی اور نہایت اہم ہیں بے پروا
ہو جائے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ جب وہ پہلی بار تمہاری خلقت اور مصوری پر قادر ہوا اور کوئی
چیز اس کو عاجز نہ کر سکی تو کم کو دوبارہ اٹھانا تو اس کے لئے اور آسان ہے۔

وَيَقُولُ الْإِنْسَانُ إِذَا مَا مِئْتُ
لَسَوْفَ أَخْرُجُ ۚ أَفَلَا يَدْرِكُ
الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن قَبْلُ
وَلَمْ يَكُنْ شَيْئًا

اور انسان کہتا ہے کہ جب میں مر جاؤں گا، زندہ
کر کے نکالا جاؤں گا، کیا انسان کو یاد نہیں کہ ہم
نے اس کو پہلے پیدا کیا حالانکہ وہ کچھ
نہ تھا۔

ان دونوں پہلوؤں سے یہ نکتہ ایک روز فیصلہ کے وقوع کو خود بخود واضح

کر رہا تھا اس لئے اس کے ذکر کی ضرورت نہیں ہوئی بلکہ فرمایا وَبَلَّغْ يَوْمَئِذٍ
تِلْكَ الْكَافِرِينَ يَوْمَئِذٍ واضح کر دے کیلئے کہ جو اللہ تعالیٰ کی اس تقدیر اور قدرت کے منکر
ہوں گے ان کے لئے خرابی ہے جب وہ دوبارہ اٹھائے جائیں گے اور دیکھیں گے کہ
وہ چیز اسے کھڑی ہے جس کا دنیا میں انکار کر رہے تھے تو ان کی تباہی ان پر پوری
طرح آشکارا ہو جائے گی۔

فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ
يَنْظُرُونَ يَوْمَئِذٍ وَقَالُوا بَيْنَا هَذَا
يَوْمُ الَّذِي بَيْنَ هَذَا يَوْمُ الْفَضْلِ
الَّذِي كُنْتُمْ فِيهِ تُكَلِّفُونَ
وہ تو بس ایک ہی ڈانٹ ہو گی دفعۃً وہ تاکنے
لگیں گے اور کہیں گے اے بچتی! یہ تو جزاکا
دن ہے، یہ فیصلہ کا وہی دن ہے جس کا تم
انکار کرتے تھے۔

تیسرے خطاب پر غور کرنے کے بعد جمع مثل بالمثل کی ایک عمدہ مثال ہمارے
سامنے آتی ہے یعنی جس طرح زمین کی خصوصیت ہے کہ وہ مٹاؤ کی دیلوں اور نشانیوں
سے معمور ہے، جیسا کہ اوپر ہم نے علوہ وغیرہ کے قصہ کا حوالہ دیا ہے، اور قرآن مجید نے
بعد ازاں اس کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے، اسی طرح زمین کی یہ بھی
خصوصیت ہے کہ وہ رحم سے بہت مشابہ ہے، بلکہ دونوں کی مشترک خصوصیات پر
غور کرنے کے بعد بے تحلف کہا جاسکتا ہے کہ جمع خصوصیات کے اعتبار سے زمین کا

پہلو نمایاں طور پر مزج ہے۔ اور قرآن مجید نے زمین کی صفت میں کفانا اَحیاء و مموات (سیٹھے والی زندہ اور مردہ کو) اسکر حقیقت اس کی اسی تزیج کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں پہاڑ گاڑ کر اس کو آرام و سکون کی جگہ بنایا۔

وَالْفُجْيٰ فِی الْاَرْضِ رَوٰیہِیْ اَنْ
اور بنائے زمین میں گڑے ہوئے پہاڑ کہ انہیں
مَمْلَکَۃً یَّکْمُرُ
لیکر راکھ نہ جائے۔

پھر ان پہاڑوں کو اونچا بنایا اور ان کے ذریعہ پادلوں کو روک کر زمین میں بقدر ضرورت پانی کا خزانہ جمع کر دیا۔ پھر اس سے سوتیں اور نریں جاری کیں۔ ان تمام امور کی طرف قرآن نے جابجا اشارات کئے ہیں۔

فَضْلُ پھاڑوں کے ذریعہ زمین کو پابجا اور مطمئن کر کے اور ان کی چوٹیوں، گھاٹیوں اور چشموں سے شیریں پانی کی سوتیں جاری کر کے، اللہ تعالیٰ نے انسان کیلئے اس کو ویسا ہی پر امن گہوارہ بنا دیا ہے، جیسا کہ رحم ہو جس میں جسم کے تمام گوشوں سے اس کے لئے غذا کا ذخیرہ خیر بخیر جمع ہوتا ہے اور جس کی تعریف میں فرمایا ہے: فَجَعَلْنٰہُ فِیْ قَرَارٍ مَّکِیْنٍ۔ بلکہ غور کرو تو معلوم ہو گا کہ ان تمام خصوصیات میں تدبیر کا پہلو نمایاں طور پر مزج ہے۔ یہ تمام باتیں جس جامعیت و کمال کے ساتھ زمین میں

پانی جاتی ہیں، اس جامعیت و کمال کے ساتھ رحم میں نہیں پائی جاتیں۔ زمین تمام مخلوقات کے لئے بمنزلہ رحم ہے۔ پھر جب انسان مرتا ہے اور اس میں دفن کیا جاتا ہے تو گویا وہ اس ماں کے رحم میں رکھ دیا جاتا ہے جس نے اسے جنا تھا۔ قرآن مجید کی یہ آیت اس حقیقت کی طرف کس قدر لطیف اشارہ کر رہی ہے۔

مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ
 اسی سے ہم نے تم کو پیدا کیا اور اسی میں تم کو دوبارہ
 وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرٰی
 اور پھر اسی سے تم کو دوبارہ نکالیں گے۔

ظاہر ہے دوبارہ پیدا کرنا پہلی مرتبہ پیدا کرنے سے زیادہ عجیب نہیں ہے پھر انسان اس کی کیوں تکذیب کرے۔ مگر وہ زمین کے معاملات اور اس کے اندر اپنی فوجدگی اور موت کی اصلی نوعیت پر غور کرے تو وہ ہرگز دوبارہ اٹھائے جانے کا انکار نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس پر ایک نئی حقیقت روشن ہوگی جو اس کے ایمان و یقین کا وہ زیادہ محکم کر دے گی۔ وہ دیکھے گا کہ جس دن وہ پیدا ہوا تو گویا پیدائشیں جیسے کمال قرار پایا اور جس دن مرا تو گویا مرا نہیں بلکہ پیدا ہوا۔ پھر وہ سب سے پہلے سے غور کرے گا تو ایک اور حقیقت اس کے سامنے آئے گی۔ وہ دیکھے گا کہ جس دن وہ مرا ہو گیا مرا نہیں بلکہ زمین کے پیٹ میں اس کا حل قرار پایا اب ناگزیر ہے کہ اس محل کے لئے بھی ایک دن وضع محل کا آئے اور وہ دونوں ہی جگہوں کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے۔

ذَٰلِزُلَّةِ السَّائِغَاتِ يَنزِلُ الْهَاقَ جب زمین میں بھونچال ڈالا جائے اور زمین
خَرَجَتْ الْأَرْضُ مِنْ أَثْقَالِهَا اپنے بوجھ باہر پڑ جائے۔

اس تفصیل پر غور کرنے کے بعد حقیقت آپس آپ واضح ہو گئی کہ اس کلام کا مقصد
ربوبیت اور احاطہ کے پہلو سے معاہدہ پر استدلال ہے جسے جب اللہ تعالیٰ ہمارے پروردگار
ہے اور ہم زندگی اور موت دونوں حالتوں میں اس کی تسبیح میں ہیں تو مانگنا کہ
ایک دن باز پرس کا بھی اُسے جس میں ہم اپنے اعمال کے متعلق جواب دہ ہوں۔
اس طرح کلام درجہ بدرجہ ایک روز فیصلہ کے ثبوت تک خود بخود پہنچ گیا۔ اور اس کی
ضرورت باقی نہیں رہی کہ نقضوں میں اس کو بیان کیا جائے۔ چنانچہ اس کے ذکر
سے گندہ کر فرمایا دینے "يَوْمَئِذٍ لِّمَن كُنَّا يُبَيِّنُ" اس دن خرابی ہے انکار کرنے
والوں کے لئے (یعنی جنہوں نے آج خدا کی پروردگاری اور اس کے احاطہ قدرت
کا انکار کیا ہے جب وہ اپنے پروردگار کے حضور جمع کئے جائیں گے تو ان کے سامنے
ان کے ہمارے بد بختی پوری طرح آشکارا ہو جائے گی، اسی حقیقت کی طرف یوں
اشارہ فرمایا ہے۔

وَنُفِخُ فِي الصُّورِ فَإِذَا هُم مِّنَ اور صور بھونچا جائے گا تو درغمتہ وہ قبروں سے
الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنسِلُونَ نکل کر اپنے پروردگار کی طرف چل پکڑے ہوں گے

قَالَ الْوَيْلُ لِمَنْ بَعَثْنَا مِنْ مَرْقَدٍ
هَذَا أَمَّا وَعَدَ الرَّحْمَنُ وَصَدَقَ
المُرْسَلُونَ

نے وعدہ کیا تھا اور پیغمبروں نے سچ کہا تھا۔
اس کے بعد بلاغت کا ایک نیا اسلوب نمودار ہوا ہے۔ یعنی جو چیز اتنی
نگاہوں سے اوجھل تھی وہ سامنے حاضر کر دی گئی ہے۔ چنانچہ کلام کا اسلوب ایسا
اختیار کر لیا گیا ہے جو ایک حاضر و مشہور چیز کے مناسب حال ہوتا ہے۔ گویا وہ فیصلہ
کا دن آگیا ہے۔ لوگ اپنے پروردگار کے حضور کھڑے ہیں۔ اور جس چیز کا اجتماع
انکار کرتے رہے تھے وہ سامنے موجود ہے۔ فرمایا۔

إِنظَرُوا إِلَى مَا كُنْتُمْ بِهِ تُكَذِّبُونَ
إِنظَرُوا إِلَى ظِلِّ ذِي ثَلَاثِ شُعَبٍ
لَا ظِلُّهُ وَلَا يَخُفُّ مِنْ اللَّهَبِ
إِنَّمَا تَرَوْنَ بِشَمْسٍ كَالْقَصْرِ
جَمَلُهُ صَفَرُهُ وَبَيْلُهُ بَيْتُ
تِلْكَ بَيْنَ هَذِهِ لَا يَخْفَوْنَ
وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَدُونَ

جس کے تم تکذیب تھے اس کی طرف چلو۔ تین طرف
پھوٹنے والے سایہ میں چلو جس میں نہ چھائوں
ہے نہ ٹپک۔ ہے بکاؤ گندہ دن کے برابر اس
میں سے چمکیاں اُڑتی ہیں، زرد اور عموں کے
مانند اس دن منکروں کی خرابی ہے۔ یہ
وہ دن ہوگا کہ ان سے بات نہ نہی گئی اور
نہ اجازت مولیٰ کہ عذبت کریں۔ اس دن

وَبَلِّغْ يَوْمَئِذٍ بَلِّغْ بَيْنَهُ هَذَا
يَوْمَهُ الْفَصْلِ جَعَلَكُمْ وَأَلَا وَلِيَّةَ
فَإِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيدُوا
وَبَلِّغْ يَوْمَئِذٍ بَلِّغْ بَيْنَهُ

مکروں کی خرابی ہے۔ یہ فیصلہ دان ہے ہم
نے تمہیں اور اگلوں کو جن کیا۔ پھر اگر تمہارے
پاس کوئی چال ہے تو ہم سے چلو۔ اس
دن مکروں کی خرابی ہے۔

الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی تاویل

(۲۹-۴۰)

[ظَلَّ ذِي ثَلَاثِ شُعَبٍ] اس سے مراد وہوئیں کا سایہ ہے۔ آگ کے
کسی بڑے الاؤ سے جب دھواں اٹھتا ہے، اس میں مختلف شاخیں پھوٹ نکلتی ہیں۔
اور وہ بالکل سا بنان کی طرح چھالیتا ہے۔ اس کی تاویل آگے بیان ہوگی۔
[الْأَخْلِيلِ الْإِي] یعنی سایہ کی ٹھنڈک سے بالکل خالی ہو گا۔ وَلَا تُغْنِي مِنَ اللَّهِ
مکمل اس کی مزید توضیح کر دی۔ ایک لفظ فرمایا ہے وَظِلِّ مَنْ يَتَّبِعُ مَوْلَاهُ وَلَا كَرِهُوا
اس میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ اور لفظ ظل (سایہ) سے جو ہم پہلے
ہو رہا تھا اس نفی نے اس کا ازالہ کر دیا۔

[أَهْلًا] یعنی وہ شے جو اس سایہ کے پیچھے ہیں۔

[کَالْقَصْرِ] مشہور قرأت سکون صاد کے ساتھ پڑھیں وہ قول ہمارے
 نزدیک صحیح نہیں ہے جو حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب ہے کہ اس سے اونٹوں
 کی گردنیں مراد ہیں اور یہ قصرۃ کی جمع بمعنی اصل العنق ہے۔ اولاً تو بعد کا قافیہ
 (فاصلہ) اس سے ہم آہنگ نہیں ہوتا ثانیاً قصرۃ گردن کی جڑ کو کہتے ہیں یعنی
 یہ انسانی جسم میں ایک مخصوص جگہ کا نام ہے کسی مستقل عضو کا نام نہیں ہے کہ اس
 شعلوں کو تشبیہ دیجائے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ قصرۃ کی جمع ہے۔ قصرۃ بڑے درخت کی
 جڑ کو کہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ قول بھی صحیح نہیں ہے۔ بعد کی تشبیہ اس سے
 مطابق نہیں ہوتی۔ پھر یہ دونوں لفظ قرآن کی زبان سے ناانوس ہیں۔ اور کوئی
 قرینہ ایسا موجود نہیں جو ان کی توجیح کر دے۔ رہا لفظ قصرۃ تو وہ قرآن میں بار بار آیا ہے۔
 پس ظاہر تاویل ہی بہانہ نزدیک قابل قبول ہے اور یہی ابن مسعودؓ سے مروی ہے۔
 تشبیہ شعلوں کے پھیلاؤ، ان کی بلندی اور رنگ میں ہے کیونکہ محل
 عموماً بلند جگہوں پر تعمیر کئے جاتے ہیں۔ اور دور سے ان کو دیکھو تو ان کا رنگ چمکتا
 نظر آئے گا اور اوپر کا رنگ نیچے کے رنگ سے مختلف معلوم ہوگا، یہاں تشبیہ
 میں محلوں کی بڑائی کا پہلو مد نظر نہیں ہے بلکہ صرف ان کی وہ ہیئت پیش نظر ہے

جو دور سے نظر آتی ہے، اہل عرب نے اس لفظ کو تشبیہ و تشبیہ دونوں معنوں میں استعمال کیا ہے اور پیش نظر وہی پہلو ہے جو ہم نے بیان کیا ہے۔
عروبن کلثوم کہتا ہے۔

واعز حنت الیمامة واشمخوت کاسیاف بایمدی مصلینا
اور یامہ کی بستاں سامنے سے ایسی ابھری نظر آتی ہیں جیسے تلواریں سونٹنے والوں کے ہاتھوں میں ہوتی ہیں۔
اس وجہ سے اونٹنی کو محل اور پل سے اکثر تشبیہ دیتے ہیں۔ یہ عربی زبان میں
اس قدر عام بات ہے کہ اس کے شواہد نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے
بعد جمالہ صفا سے جو تشبیہ دی ہے اس سے دعویٰ پر فرید روشنی پڑتی ہے۔

[کانہ جمالہ صفا] ضمیر کا مرجع شمر ہے، اور یہاں رعایت لفظ کی
لگی ہے۔ شمر اسم صنف ہے اس لئے ذکر، مؤنث، واحد جمع سب کے لئے اس کا
استعمال یکساں ہوتا ہے۔ یہاں جمع کے مفہوم میں ہے اور جمالہ صفا سے
تشبیہ اس کا ثبوت ہے۔ جمالہ زراونٹوں کی جماعت کو کہتے ہیں۔ یہ تشبیہ شعلوں
اور چنگاریوں کے رنگ اور ان کی پڑائی دونوں کو ایک ہی ساتھ نمایاں کر رہی ہے۔
صفا زردی کی قیاس لئے لگائی ہے کہ دہو میں کی آڑ سے شعلوں کا منظر ایسا
ہی دکھائی دیتا ہے۔

”ظَلَّ فِي ثَلَاثِ شُعَبٍ اِكْلَ لَطِيفِ نَكْتَةٍ“

[ظَلَّ ذِي ثَلَاثِ شُعَبٍ (تین طرف پھوٹنے والا سایہ) جہنم کو اس طرح مصور کر کے پیش کر رہا ہے گویا وہ کسی جاندار چیز کی طرح پسلی ہوئی چلی اُڑ رہی ہے اور اس کا دھواں تین مختلف سمتوں میں پھیلا ہوا ہے۔ قرآن مجید میں دوسرے مقامات میں بھی جہنم کی تصویر کچھ اسی سے ملتی جلتی پیش کی گئی ہے۔ مثلاً

وَأَعْتَدْنَا لَهُنَّ كَذَّابًا لِلْسَّاعَةِ
سَعِيرًا إِذَا رَأَاهُمُ مِنْ مَكَانٍ بَعِيدٍ
سَمِعُوا لَهَا تَغِيظًا وَزَفِيرًا
اور جنہوں نے قیامت کا انکار کیا ہم نے ان کیلئے دوزخ تیار رکھی ہے جب ان کو دور ہی سے دیکھے گی، وہ اس کا زور شور سنیں گے۔

اس سے زیادہ واضح تصویر سورہ ق میں ہے۔

يَوْمَ نَقُولُ لِمَنْ هُمْ هَلْ أَتَيْنَاهُم مُّتَلَتِّ
وَنَقُولُ هَلْ مِنْ مَزِيدٍ
جس دن ہم پوچھیں گے جہنم سے کیا توجہ ہوئی
اور وہ کہے گی کہ کیا اور ہے؟
دوسری جگہ فرمایا ہے۔

إِنَّمَا لَطِ نَزَاعَةٌ لِّلشَّوْمِ
تَدْعُوْنَ مِنْ أَدْبُرٍ وَتَوَلَّى
بیشک وہ پسٹا ہوا دھیرے کی پٹھلی کا گوشت
اور جنہوں نے اعراض کیا اور سرگردانی کی ان کو

یہاں ثلث شعب سے ظاہر مقصد صرف آگ کے سببان واشتعال کو بتلانا ہے لیکن اگر اس پر غور کیجئے تو فکر و نظر کے لئے بھی اس میں کافی وسعت ہے۔ یہ معلوم ہے کہ کفر کی بنیادی خصلتیں تین ہیں، اللہ تعالیٰ سے غفلت، (۲) مخلوق سے بے پروائی (۳) روز جزا کا انکار۔ ان امور کی تفصیل اپنے موقع سے گز چکی ہے۔ یہاں زیادہ وسعت کے ساتھ اس پر بحث کی ضرورت نہیں ہے تاہم بعض شواہد کا حوالہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

ایک جگہ اہل جنت اور اہل جہنم کا ایک مکالمہ ان نقطوں میں مذکور ہوا ہے۔

مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرٍ ۚ قَالُوا لَمْ نَكُنْ
 مِنْ الْمُصَلِّينَ ۚ وَكُنْ نَدْعُ نَطْعُ
 الْمُسْكِينِ ۚ وَكُنَّا تَخَوَّنُ
 الْحَاثِثِينَ ۚ وَكُنَّا نَكْذِبُ
 بِمَوَالِدِ تَيْنِ ۚ

کون چیز تم کو دوزخ میں لائی کہیں گے ہم
 نہ نماز پڑھا کرتے تھے اور نہ مسکین کو کھانا کھلاتے
 تھے، جو لوگ بیہودہ کہو اس کیا کرتے تھے
 ان کے ساتھ ہم بھی کہو اس کیا کرتے تھے
 اور جزا کے دن کا انکار کرتے تھے۔

اس آیت میں خوخی سے عود انکار قرآن ہے اور اس انکار کی اصلی وجہ ہنسی کہ قرآن و جزا کی خبر دیتا ہے جس کو تسلیم کرنے کیلئے وہ ہرگز ناموہ نہ تھے۔ دوسری جگہ فرمایا

أَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ ۖ وَصَدَّقَ

سو جس نے سخاوت کی اور ڈر ڈر پلا اور اچھی بات

يَا حُصَيْنِي فَسَيِّئَتِ لِي لَيْسَتِي بِحَيٍّ ۖ يَا اِهْلَ اَيْمَانٍ كَمْ مِثْلِي كَرِهَتْ اَرْحَامُ دِيْنِهَاۤ اَوْ
وَمَا مَنَ بَحْلٌ وَاَسْتَفْنَىٰ وَكَذَّبَ ۚ جس نے نکالت اور بے پروائی کی اور اچھی بات
يَا حُصَيْنِي فَسَيِّئَتِ لِي لَيْسَتِي بِحَيٍّ ۖ جھٹلایا اس پر سچ کر دینگے منکھل میں ڈالنے والی
ان دونوں آیتوں کے مطالب پر پوری وسعت کے ساتھ غور کرو مان سے
کفار کی یہ تینوں بنیادی خصلتیں پوری طرح نمایاں ہو جائیں گی۔ اس سے یہ بات
سمجھ میں آتی ہے کہ انہی تین خصلتوں کے مطابق جہنم سے عذاب کی تین شاخیں
نمودار ہو کر ان کی طرف بڑھیں گی اور ان کو چھالیں گی۔ وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ۔
اسی سے لگتی ہوئی تاویل حضرت ابن عمرؓ سے منقول ہے۔

ابو عبد اللہ عبد بنی راوی ہیں کہ میں بیت المقدس میں آیا، دیکھا کہ عبادہ بن
صامت، عبد اللہ بن عمر اور کعب احبار بیت المقدس میں بیٹھے ہوئے تھے
کر رہے ہیں۔ عبادہ نے کہا جب قیامت کا دن آئے گا، اللہ تعالیٰ لوگوں
کو ایک میدان میں جمع کرے گا یہاں تک کہ ایک ہی جگہ سے ان کو
نگاہ دیکھ سکے گی اور وہ اپنی آواز سنا سکے گا اور اللہ تعالیٰ ان سے فرما گا
آج کے دن ان کے منہ سے بات نہ نکلے گی یہ فیصلہ کا دن ہے، ہم نے
تم کو اور تمہارے انگوٹوں کو جمع کیا ہے۔ پس اگر آج تمہارے پاس

کوئی واؤ ہو تو وہ ہمارے ساتھ کرے گیو، آج کوئی متمرّد اور سرکش شیطان مجھ کو
 نجات نہ پاسکے گا، اس کے بعد عبد اللہ بن عمر نے کہا کہ کتاب میں ہم پاتے
 ہیں کہ قیامت کے دن ہنم سے ایک گردن نمودار ہوگی اور جب وہ لوگوں
 کے سامنے آئے گی تو کہے گی اے لوگو! میں تین قسم کے لوگوں کے ہوں
 : پہلی گئی ہوں جن کو میں اس سے زیادہ پہچانتی ہوں بتا باپ اپنے بیٹے کو
 اور بھائی اپنے بھائی کو پہچانتا ہے، آج انکو نہ کوئی چیز بچا سکتی ہے اور نہ کوئی چھپا سکتی۔
 خدا کا شریک ٹھہرانے والے بجا اور سرکش اور متمرّد شیطان فرمایا۔ پھر
 ان کو پیٹ لے گی اور جنہم میں حساب چالیس سال پہلے ڈال دیگی (دفعہ پنجم)،
 مجھے خیال ہوتا ہے کہ یہاں عبد اللہ بن عمر نے جن تین جماعتوں کا ذکر
 فرمایا ہے وہ آیت ذیل سے اخذ کر کے فرمایا ہے۔

الْقِيَامِ فِي جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيدٍ ڈالو جنہم میں ہر ناشکرے سرکش، جلائی سے
 مُتَاعٍ لِلْخَيْرِ مُعْتَدٍ يُؤْتِي الدِّنَارَ روکنے والے، حد سے بڑھنے والے، رشک میں
 جَعَلَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ فَالْقِيَامِ پڑھنے والے کو جس نے اللہ کے ساتھ دوسرا
 فِي الْعِلَادِ لَشَدِيدٍ مسموم ٹھہرایا پس اسکو ڈالو سخت عذاب میں۔
 اسی گراس پر تامل کرو تو وہی تین صفتیں تمہارے سامنے آئیں گی۔

جو اوپر ہم نے بیان کی ہیں یعنی خلق خدا سے بے پروائی، آخرت کا انکار، عداوت
غفلت، کیونکہ شرک خدا سے غفلت ہی کا نتیجہ ہے۔

ان آیات کے نظم و مواقع تزیین پر ایک نئی نظر

اوپر یہ بات گذر چکی ہے کہ یہاں خطاب کا اسلوب ایسا اختیار فرمایا ہے کہ
جس سے پردہ کی چیز بالکل نگاہوں کے سامنے آگئی ہے اور ظاہر ہے کہ
تأثیر کے اعتبار سے یہ اسلوب نہایت اعلیٰ ہے اور چونکہ یہ تاثیر کمال درجہ پر پیدا
کرنی تھی اس لئے قیامت کی تصویر ایسی کھینچی جو مخاطب کے حواس پر پوری طرح
چھا جائے۔ پھر اسی مناسبت سے دلیل کا ذکر فرمایا اور یہاں آیت دلیل کے
محل نے خود اس مضموم کو پوری طرح واضح کر دیا جو یہاں پیش نظر ہے۔ یعنی
یہ عذاب جو اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ ان کے لئے بالکل تیار ہے، ان
کے لئے نہایت خوفناک خرابیوں کا سبب ہوگا۔

شدت عذاب کے محسوس پہلو کی تصویر کے بعد اس کے اس پہلو کو
بے نقاب کیا جس کا احساس ذہن کر گیا۔ یعنی معذرت کی فرصت سے محرومی۔
اور یہ عذاب کی ظاہری ہولناکیوں کے بعد اس کا ایک باطنی تازیانہ ہوگا جو براہ راست

دلوں پر لگے گا۔ چنانچہ اس کے بعد آیت ویل کو پھر دہرایا اور موت کے مخصوص حالات کے لحاظ سے اس کا مفہوم یہاں اس سے مختلف ہے جو اوپر بیان ہوا یہاں یہ مفہوم ہے کہ اس دن ان کے لئے خرابی اور حسرت و نادمی کے سوا کچھ نہ ہو۔ عذر و معذرت کے تمام دروازے بند ہو جائیں گے۔

ان ترہبات کے بعد ان کو پھر ایک نئے امانت سے خطاب فرمایا، اس خطاب میں جھڑکی اور اسکات و تذلیل کا پہلو نمایاں ہے۔ اور دنیا میں معاویہ جو وہ انکار کرتے رہے ہیں اس کا بانداز تحقیر جواب ہے۔ اس اسلوب کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا۔

هٰذِهِ النَّارُ الَّتِي كُنْتُمْ تُحِبُّونَ
تَكُنْ بُؤْسًا فِیْهِ هٰذَا الَّذِیْ كُنْتُمْ
لَا تَبْصُرُونَ

یہی وہ جہنم ہے جس کا تم انکار کرتے تھے۔
یہ جادوسہ یا نہیں سوچھائی نہیں دیتا۔

اس خطاب میں اپنی قدرت کی بے پناہ وسعت کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ ہم نے تمام انگلوں اور پتھروں کو جمع کر لیا ہے۔ کوئی نہیں جو آج کے دن ہمارے پکڑے رہا ہو۔ اس کے بعد پھر ایک خطاب نمودار ہوتا ہے جو خطاب کو مخاطب کے سامنے مشہود کر دیتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی واضح ہو جاتی

ہے کہ اس دن تمام تدبیریں اکارت ہو جائیں گی۔ کوئی داؤ کام نہ آئے گا۔ اور جس طرح اوپر یہ بیان فرمایا تھا کہ اس دن عذر و معذرت کی تمام راہیں بند ہو جائیں گی۔ اسی طرح بیان فرمایا کہ اس دن نہ کوئی چال اور تدبیر کام آئے گی نہ کوئی طاقت و قوت کچھ نفع پہنچائے گی۔ اس میں گویا ایک مخفی تعویض ہوگی کہ دنیا میں ان کو اپنی تدبیروں اور قوتوں پر بڑا غرہ تھا، پھر آج ان سے کام کیوں نہیں لیتے؟ اس مضمون کے بعد آیت دہیں پھر نمودار ہو گئی اور یہاں موقع کے لحاظ سے اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ اس دن ان کا کوئی داؤ کام نہ آئے گا، تمام تدبیریں دھری رہ جائیں گی۔ صرف تباہی اور ذلت و رسوائی نصیب ہوگی۔ یہ چالیس آیتیں تمام ڈراوے کی ہیں، ان کے بعد خجع و مغیب و ترہیب کے اس عام اصول کے مطابق جس کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں، بشارت کی آیتیں آئیں تاکہ سختی اور نرمی کی ایک معتدل حالت پیدا ہو۔ پس فرمایا۔

اِنَّ الْمُتَّقِينَ فِيْ ظِلَالٍ وَمُكْمُوْنَ ۝
وَفَوَاقِهِمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ ۝۲۲ کُلُوْا
وَلَا تُسْرِفُوْا هٰذَا الَّذِیْ تَعْمَلُوْنَ ۝۲۳
اِنَّا کُنَّا اللّٰهَ جَعَزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۝۲۴

بے شک پرہیزگاروں کو سایہ ہوں گے اور
نہیں۔ اور عیب بھی چاہے مہوے۔ مرنے کو کھاؤ
اپنے اعمال کے بدلے، بھلائی کرنے والوں کو
ہم یونہی دیا کرتے ہیں۔ اس دن منکروں

وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ۝ كَلُوا
 وَفَتَعُوا قَلِيلًا تَاكُمُ الْجُحُومُ ۝
 وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ۝ وَإِذَا
 قِيلَ لَهُمُ اسْكُفُوا أَعْيُنَكُمْ عَنْ
 وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ۝
 فَيَأْتِي حَتَّىٰ يَذُفُّ عَنْ يَوْمَئِذٍ

کی خرابی ہے۔ چند روز کھا لو اور ترے
 کر دو تم تو ٹھہرے گنہگار۔ اس دن کھڑے
 کی خرابی ہے۔ اور چکے کو ان سے کہا
 جائے تو نہیں جھکے۔ اس دن منکروں
 کی خرابی ہے۔ اب اس سے بڑھ کر
 کی بات ہے جسے انہیں سنئے۔

الفاظ کی تفسیر اور جملوں کی تاویل

[فِي ظِلَالٍ] یعنی سایوں کے درمیان۔ قرآن مجید میں یہ مضمون اور
 اسلوب بہت آیا ہو مثلاً اصحاب الیمین مَا أَصْحَابُ الیمینِ فِي سِدْرٍ مَّخْضُودٍ وَ
 ظِلِّ مَنُودٍ وَظِلِّ مَمْدُودٍ وَمَاءٍ مَّسْكُوبٍ فَآكِهَةٍ كُنُوزٍ لَا مَقْطُوعٍ لَهَا
 مَنُوعَةٍ وَفُرُشٍ مَّرْفُوعَةٍ اَوْ مَصْرُوحَةٍ ان نعمتوں کا بیان ہے جن سے وہ گھر
 ہوں گے۔ یہی اسلوب برج بن مسہر الطائی نے استعمال کیا ہے۔

فَبَسْتَابِینَ ذَاکَ وَبِیْنِ مَسَدٍ فیا عجبا العیش لوید و
 پس ہم نے اس میں اور مشک کی خوشبوؤں میں شب بسر کی کیا نرے کی زندگی تھی اکاش ہمیشہ رہتی

[ہینا] فعل مقدم سے جو مفعول مفہوم ہوا ہے اس سے حال
 پتا ہوا ہے۔ وہ سری جگہ فرمایا ہے۔ فَكَلِمَةُ هِنَا مَرِيَّتًا جس میں ذوالحال واضح
 ہے۔ ذوالحال مقدر سے حال پڑنا عربی زبان کا ایک معروف اسلوب ہے۔
 شاعرانہ لہجہ کے لئے کہیں گے لامتناہی مہلایا۔

[وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ] اذنا کا نام استعمال مستقبل کے لئے ہے۔ فریاد
 میں دوسری جگہ یہ بات وساحت کے ساتھ بیان کر دی گئی ہے۔ کہ جب میں
 سب لوگ اکٹھے کئے جائیں گے تو پروردگار کے حضور سجدے کیلئے بلائے
 جائیں گے تو جن لوگوں نے دنیا میں سجدہ نہ کیا ہوگا، وہ اس دن سجدہ نہ کر سکیں گے۔
 يَوْمَ يَكْشِفُ عَنْ سَاقِيَدَيْكَ حُجَّتَہِمْ تَبَيَّنَ جس دن کہ پیل پڑے گی اور وہ بلائے جائیں
 اِنْفِ السُّجُودِ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ کے سجدے کیلئے پس سجدہ نہ کر سکیں گے اور
 خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْتَفِقُهُمْ ان کی نگاہیں جھکی ہوں گی، ذلت چھائی ہوگی
 خِلَّةً وَقَدْ كَانُوا يُدْعَوْنَ اِلَى اور وہ سجدے کیلئے بلائے جاتے تھے اور
 السُّجُودِ وَهُمْ سَآئِمُونَ اس وقت بالکل صحیح و سالم تھے۔

پس آیت کی تاویل یہ ہوگی کہ وہ فیصلہ کے دن سجدہ نہ کر سکیں گے۔
 حضرت ابن عباسؓ سے بھی اسی طرح کی روایت ہے۔ دوسری تاویل یہ ہو سکتی

ہے کہ اذا مادت کو بیان کرنے کیلئے آتا ہے اس مفہوم کے لحاظ سے تاویل یہ ہوگی کہ وہ دنیا میں نہیں جھکتے۔ اس کے بعد ہے وَنُلِّیْ یَوْمَئِذٍ لِّلْمُکْلِیِّنَ بِیْنِیْ سباق سے اس آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ چونکہ وہ دنیا میں نہیں جھکے تو آخرت میں بھی نہ جھک سکیں گے۔ اور یہ امر ان کے لئے باعث خرابی ہوگا۔

یہ محض الفاظ کا فرق ہے ورنہ حقیقت کے اعتبار سے دونوں تاویلوں کا مآل ایک ہی ہے۔

[بعد لا] یعنی اس بات کے بعد جو بہترین دلائل اور واضح ترین برہین کے ساتھ ان کو معاد اور خدا پرستی کی تلقین کر رہی ہے، دوسری جگہ فرمایا ہے فَبَآئِیْ حَدِیْثٍ بَعْدَ اَللّٰہِ وَاٰیَاتِہِمْ یُؤْمِنُوْنَ۔ پس اللہ اور اس کی آیات سے بڑھکر کیا بات ہے جس پر ایمان لائیں گے۔ پس بعد کا مفہوم وہی ہے جو فقہاء حدیث سے مرشح ہو رہا ہے یعنی اگر اس بات پر ایمان نہیں لاتے تو اب کوئی بات اس سے زیادہ واضح اور دلوں میں گھر کرنے والی ہوگی کہ اس پر ایمان لائیں گے۔

بعض لوگوں نے بعد کا سے یہ مفہوم سمجھا ہے کہ اس دن کے بعد لیکن ہمدے نزدیک یہ احتمال ضعیف ہے۔ اس دن تو بہر حال ایمان لائیں گے۔

یہ بات غلط بھی واضح ہے اور قرآن بھی اس کا شاہد ہے۔ اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ لَئِنْ لَوْفَعْتَهَا كَاذِبَةٌ۔ اگر مقصود یہ ہوتا تو یہ فرمایا جاتا۔ فلا ہی نفع بعد کا یومنون (اس دن کے بعد کس فائدہ کے لئے ایمان لائیں گے) ممکن ہے اس مفہوم کی تائید میں آیت ذیل سے دلیل لائی جائے۔

وَاِنْ يَنْهَوْهُمْ عَنْ يَوْمِهِمْ الَّذِي يَكُونُ قُلُوبُهُمْ مُتَمَرِّضِينَ لَهُ ۚ لَنَمَسُّهُمْ نَحْمًا ۚ اَوْ يَشَاءُ لِيَمْلِكُنَّ ابْنُ الْاِنْسِ وَابْنُ الْوَحْشِ ۚ لَنَمَسُّهُم مِّنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُونَ

اور شاید کہ ان کی اہل قریب ہوں تو اس
 کے بعد کس بات پر ایمان لائیں گے۔
 یومنون

اس کے بعد یعنی اہل کے آجانے کے بعد۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ دلیل واضح نہیں ہے۔ اولاً تو یہاں اجل کا لفظ صریحاً مذکور اور پاس ہی موجود ہے جس کی طرف تفسیر کو تہ تکلف ٹوٹایا جاسکتا ہے۔ ثانیاً یہاں بھی کچھ ضروری نہیں کہ یہ مطلب لیا جائے۔ سیاق کلام نہایت واضح طور پر ایک دوسری حقیقت کی طرف رہنمائی کر رہا ہے۔ اوپر کی آیت پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان لوگوں کو ہلاکت کی جارہی ہے جو کتاب اللہ اور انبیاء و رسل کے منکر ہیں۔ پس اس مضمون کے اعتبار سے وہی تاویل موزوں ہوگی جو ہم نے اختیار کی سلف کا مذہب بھی یہی ہے۔ چنانچہ علامہ ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

”فَبِمَا حَسِبْتَ بَعْدَ لَا يُؤْمِنُونَ“۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ محمدؐ کی تحذیر کے بعد اب وہ کونسی تحذیر و تنوید ہے جس پر وہ ایمان لائیں گے اگر اس کتاب کی تصدیق سے ان کو انکار ہے تو اب کونسی کتاب جس کی وہ تصدیق کریں گے۔“

بعض دوسرے مفسرین کا بھی یہی مذہب ہے۔ پس اس آیت سے جو ثبوت پیش کیا گیا ہے وہ ہمارے نزدیک بہت زیادہ قابل اعتماد نہیں ہے۔

آیات کی تاویل اور ان کا نظم

[كُلُوا وَاشْرَبُوا] میں غائب کو مشہور و مصور کرنے کا وہی اسلوب ملحوظ ہے جو انظالمقوا میں ہم بیان کر چکے ہیں۔ [إِنَّا كَذَّبْنَا نَجْوَى الْمُحْسِنِينَ] میں دو تاویلوں کا احتمال ہے۔ ایک یہ کہ اس کو پچھلے خطاب سے بالکل متصل مانا جائے اور ان آیات کے سیاق و مضموم میں لیا جائے جو اکثر آخرت کی نعمتوں کے ذکر کے بعد وارد ہیں، مثلاً فرمایا۔

إِنَّ هَذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاءً وَكَانَ سَعْيُكُمْ مَشْكُورًا
یہ تمہارے لئے بدلہ ہے اور تمہاری کوشش مقبول ہوئی۔

دوسری جگہ ہے۔

وَيَذَلُّكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا اور یہ جنت ہے جس کے تم وارث ہوئے

يَمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ہو اپنے عمل کے بدلے میں۔

دوسری یہ کہ اس کو اتفاقات اور خطاب کے مفہوم میں لیا جائے اور اس کے

نظارہ بھی قرآن مجید میں بہت ہیں اور نظائر ہی پر محول کرنا او ٹی ہے۔

آیت ویل یہاں بطور مقابلہ ہے یعنی جبکہ نیکو کاروں کو ان کے اعمال

کے صلہ میں نعمتیں مرحمت ہوں گی۔ ان منکروں کے لئے عذاب ہوگا۔ اور یہ عذاب

ان کے لئے دوسرا ہو جائے گا۔ ایک طرف تو عذاب کی اذیت ہوگی۔ دوسری

طرف مومنین کی کامیابی پر حسرت و اندوہ اور یہ غم بالائے غم ہے۔

[كُلُوا وَامْتَنِعُوا قَلِيلًا إِنَّكُمْ جُعِلْتُمْ كَافِرِينَ] اس آیت میں کافروں سے

خطاب ہے اور اس میں بلاغت کے بہت سے اسالیب اکٹھے ہو گئے ہیں۔

(۱) اوپر مومنین کی نعمتوں کا ذکر تھا۔ پس اس آیت میں گویا اسکی مقابل حالت کا بیان ہوا۔

(۲) اسی میں جلد عذاب آنے کی دہائی ہے۔

(۳) دنیا کی اس حقیر بوخی پر ان کو جو گھمٹ ہے اس پر ملامت ہے۔ گویا

ان کے لئے عذاب مقدر ہو چکا ہے۔ صرف عفو ہی سی مہلت دیدی گئی ہے۔

جو کھانا پینا چاہتے ہیں کھاپی لیں بالآخر یہ حلق کی پھانس ہوگا۔

(۴) اِنَّكُمْ مَّحْجُومُونَ روز جزا پر دلیل ہے یعنی چند روز کھاپی ہو تمھارا مجرم ہونا طے پا چکا ہے۔ پس ضرور ہے کہ ایک دن باز پرس اور بدلہ کا آئے۔ ایک جگہ اس مضمون کی وضاحت ہو گئی ہے۔ قل تمتعوا فان مصيرکم الی الناس۔ کہ دو، چند روز مزے کر لو، کیونکہ تمھارا ٹھکانا جہنم ہے۔ اس کے بعد آیت دیل آئی ہے جس سے مقصود دلیل کی شدت اور قطعیت کا بیان ہے۔

[وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اسْكُوا لَآئِن كَعُونَ] یہ اپنی دونوں دلیلوں کے اعتبار سے اِنَّكُمْ مَّحْجُومُونَ کا بیان ہے۔ کیونکہ جو دنیا میں اپنی پروا کے حضور نہ جھکا وہ حقیقت میں بہت بڑے جرم کا مرتکب ہوا۔ اولین فیضیہ خدا کے سامنے پستی و فروتنی کا اظہار ہے اور سب سے بڑی مصیبت خدا سے استکبار۔ اور یہ کذیب و انکار کا لازمی نتیجہ ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

فَاَصْدَقَ وَلَا صَلَٰ وَلَٰكِنْ
کَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰی
اَهْلٍ یَّمْنٰطِ اُولٰٓئِیْ لَیْسَ فَاوَلٰی

پس نہ تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی بلکہ انکار کیا اور منہ موڑا پھر اگڑا ہوا اپنے لوگوں کی طرف چل دیا۔ تیرے لئے ہلاکتی ہے۔ پھر ہلاکتی

ثُمَّ اَوْحٰى لَكَ فَادْعْنِی۔ ہے اور پھر بلا کی ہے اور پھر بلا کی ہے۔

دوسری تاویل کے اعتبار سے مضمون یوں ہوگا کہ پہلے فرمایا کہ تم آج بحر ہو، اس کے بعد فرمایا کہ ان کا جرم قیامت کے دن کھلے گا۔ جب وہ جھکنے کیلئے بلائے جائیں گے، لیکن جھک نہ سکیں گے۔ اس کے بعد آیت ویل کا مفاد یہ ہوگا کہ یہ ویل ان کے عدم وقوع کا نتیجہ ہوگا۔ اور یہ مضمون آیت کی دونوں تاویلوں کے لحاظ سے بن جائے گا۔

”جِنَابِی حَدِیْثٌ بَعْدَ لَا یُؤْمِنُوْنَ“ یہ قاتمہ کی ایک جامع آیت ہے جس میں ان تمام مضامین کی طرف انگلی اٹھادی ہے جو از قبیل دلائل واز قسم ترغیب و ترہیب اور بیان ہوئے تھے۔ اور اسلوب استفہام میں یہاں متعدد نکلتے مضمر ہیں۔

(۱) اس سے اس کلام کی عظمت و منزلت اور تبلیغی اعتبار سے اس کی جامعیت واضح ہو جاتی ہے۔

(۲) ان کے ایمان کی طرف سے ناامیدی ترشح ہوتی ہے۔

(۳) ان کے انکار پر تشنیع ہے۔

پھر آیت کے موقع سے یہ بات نمایاں ہے کہ تمام محبت کے بعد

یہ تودیع کا آخری جملہ ہے۔ اس اسلوب کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں۔ مثلاً آخر سورہ طارق میں فرمایا۔

وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ وَلَا تَرْضَىٰ
ذَاتِ الصَّدْرِ إِنَّكَ لَقَوْلٌ فَضْلٌ
وَمَا هُوَ إِلَّا نَهْلٌ إِنْ هُمْ إِلَّا كِيدٌ
كِيدًا أَوْ كِيدٌ كِيدًا فَمَهْلٌ
الْكَافِرِينَ أَمِ هُمْ رُؤُودٌ
شاید ہے آسمان پر نگار اور زمین پر تنگناں
کہ یہ دو ٹوک بات ہے اور معرّی ہنسی نہیں
وہ چل رہے ہیں ایک چال میں چل رہا
ہوں ایک اور چال یسوعھوڑ دو کا فرو
کو ذرا دیر کو۔

سورہ زخرف کے اخیر میں ہے۔

فَاصْفِهِ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلَامٌ
فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ
پس ان سے درگزر کرو اور کہو سلام
وہ جلد جان لیں گے۔

اسی اسلوب کے مطابق خاتمہ کی آیت سے یہاں بھی واضح ہے کہ جب اس بات پر ایمان نہیں لاتے تو اب وہ کس چیز پر ایمان لائیں گے پس ان کو چھوڑ دو، تھوڑے دن کھاپی لیں اور مزے اڑالیں۔
مُكَلِّمِينَ سے متعلق ہم نے اوپر تاویل کے جو پہلو بیان کئے تھے، خاتمہ کی آیت نے اس دوسرے پہلو کو واضح کر دیا کہ یہی منکر ہیں جو اللہ

کئے کلام کا انکار کرتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ دراصل قرآن کا انکار نتیجہ ہے ان کے انکار قیامت اور نماز اور بندگی سے بے پروائی کا۔ اور یہ مضمون قرآن مجید میں بار بار بیان ہوا ہے۔ اور اس کے بعض ثبوت دوسری فصل میں بیان ہوئے ہیں۔

هٰذِهِ اٰخِرُ مَا نَنْبِئُكَ لِنَاذِرٍ
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ عَلَى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ
وَالْهُدَىٰ إِلَىٰ جَمْعِهِ

۲۹۷۱۳ ۱۳۸۵۶ ح-ت ع

آخری درج شدہ تاریخ پر یہ کتاب مستعار
لی گئی تھی مقررہ مدت سے زیادہ رکھنے کی
صورت میں ایک آنہ یومیہ دیرانہ لیا جائیگا۔

